حافظ طاہر الاسلام [1]

تبدیلی احکام پر اولیات عمر رضی اللہ عنہ سے استدلال اور اس کا تجزیہ

Abstract

Inference from the Precedents of 'Umar in the Alteration of Rulings

Awwallīyāt of 'Umar refer to those rulings that 'Umar bin Khattāb initiated in his reign. According to a group of modernist academics, these precedents or rulings are a proof that Shar'ī rulings alter with respect to time and circumstances. However, the author of this treatise, argued that these Awwallīyāt of 'Umar RA do not imply abrogation of Shar'ī rulings rather these were his inferences from the general guidelines of Sharī'ah that he legislated in his time. In the eyes of the author, the modernists have erred in their deductions and therefore, have reached a debatable conclusion.

تمہید

احوال وزمانہ کے تغیر سے شرعی احکام میں تبدیلی کے جواز پر استدلال کی ایک اہم اساس سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے وہ اقدامات ہیں جنہیں عموماً "اولیات عمر رضی اللہ عنہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ ان اقدامات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات سے مختلف طرز عمل اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ اسی کو بنیاد بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ حالات وظروف یا مصلحت کی مناسبت سے شریعت کے منصوص احکام میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

ان مثالوں کو ان تمام حضرات نے پیش کیا ہے جو تبدیلی کے احکام کے قائل ہیں چنانچہ ڈاکٹر صبحی محمصانی رحمہ اللہ نے "فلسفہ شریعت اسلام" میں، [2] مولانا حنیف ندوی رحمہ اللہ (متوفی 1987ء) نے "اجتہادی

---

1 لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

2 صبحی محمصانی، ڈاکٹر، فلسفہ شریعت اسلام: ص 217-222، مترجم مولوی محمد احمد رضوی، ترقی ادب، لاہور، 1996ء

مسائل، مسئلہ اجتہاد" میں،[1] مولانا محمد تقی امینی رحمہ اللہ (متوفی 1991ء) نے "احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت" اور "اجتہاد" میں،[2] مولانا جعفر شاہ پھلواروی رحمہ اللہ نے "اجتہادی مسائل" اور "اسلام دین آسان" میں،[3] سید یعقوب شاہ (متوفی 1986ء) نے "قوانین اسلامی کے نفاذ کا مسئلہ" میں[4] اور غلام احمد پرویز (متوفی 1985ء) نے "شاہکار رسالت" میں[5] میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ان اقدامات کا تذکرہ کیا ہے۔

ان کی اہمیت کے پیش نظر زیر نظر مقالہ میں ان کا تحلیل و تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں صرف انہی چند مثالوں کو زیر بحث لایا گیا ہے جن سے واقعتاً شرعی احکام میں تغیر کا تاثر ملتا ہے۔ اس لیے کہ اولیات عمر رضی اللہ عنہ میں کئی امور ایسے ہیں، جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نصوص شریعت کی عمومی تعلیمات کی روشنی میں جاری کیے اگرچہ شریعت میں صراحتاً ان کا ذکر موجود نہ تھا۔ انہیں احکام میں تغیر و تبدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ بعض معاملات ایسے ہیں کہ پہلے ان سے متعلق کوئی ہدایت موجود تھی لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے ہٹ کر طریق عمل اپنایا۔ یہی درحقیقت ان حضرات کا مدار استدلال ہیں۔ لہٰذا ذیل میں انہی کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

پہلا مسئلہ: عراق کی مفتوحہ زمینوں کو قومی ملکیت میں لینا

غلام احمد پرویز صاحب تغیر حالات کے ماتحت فیصلوں کی تبدیلی کی مثالیں بیان کرتے ہوئے "اختلافی فیصلے" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

> "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت صدیقی رضی اللہ عنہ میں قانون یہ تھا کہ مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ فتح عراق کے وقت مال غنیمت میں کثیر مزروعہ زمینیں بھی ملیں۔ سابقہ قاعدے کے مطابق، مطالبہ ہوا کہ انہیں بھی سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے لیکن سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ان زمینوں کی پیداوار پر ساری امت اور آنے والے نسلوں کی پرورش کا دارومدار ہے اس لیے انہیں انفرادی ملکیت میں نہیں دیا جاسکتا۔ یہ اجتماعی ملکیت کی تحویل میں رہیں گی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا برقرار رہا۔ یہ سابقہ قانون سے بڑا اہم اختلاف تھا۔"[6]

---

1 ندوی، محمد حنیف، مولانا، مسئلہ اجتہاد: ص201-204، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1994ء

2 امینی، محمد تقی، مولانا، احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت: ص177-304، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، 2007ء

3 پھلواروی، شاہ محمد جعفر، مولانا، اجتہادی مسائل: ص9-10، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع چہارم، 1999ء

4 یعقوب شاہ، سید، قوانین اسلامی کے نفاذ کا مسئلہ: ص 122-278، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 2008ء

5 پرویز، غلام احمد، شاہکار رسالت: ص278-281، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 1999ء

6 شاہکار رسالت: ص280

اس کا تذکرہ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے "اجتہاد" میں[1] اور مولانا محمد تقی صاحب امینی رحمۃ اللہ علیہ نے "احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت"[2] میں بھی کیا ہے۔

تجزیہ استدلال

اس سلسلہ میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں مزروعہ زمینیں لازماً سپاہ میں تقسیم ہی کی جاتی تھیں یا اس کے علاوہ بھی کوئی صورت موجود تھی؟

زمینوں کی تقسیم متعین قانون نہیں

ارباب علم و نظر کی رائے یہ ہے کہ ایسا کوئی قانون متعین نہ تھا، جس کی رو سے زمینیں لازمی طور پر مجاہدین میں تقسیم کی جاتی ہوں۔ بلکہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں متنوع طرز ہائے عمل اپنائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا کوئی حکم بھی موجود نہیں، جس کی بناء پر ایسا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہو۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1979ء) اسی نوعیت کے استدلال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کبھی نہیں فرمایا تھا کہ مفتوحہ زمینیں ہمیشہ مجاہدین میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ اگر ایسا کوئی حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہوتا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف عمل کیا ہوتا تو آپ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بدل دیا یا پھر یہ دعویٰ اس صورت میں کیا جاسکتا تھا جبکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہی زمینوں کو مجاہدین سے واپس لے لیا ہوتا جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں تقسیم کیا تھا، لیکن ان دونوں میں سے کوئی بات بھی پیش نہیں آئی۔ اصل صورت معاملہ یہ ہے کہ مفتوحہ زمینوں کو لازماً مجاہدین ہی میں تقسیم کر دینا سرے سے کوئی اسلامی قانون تھا ہی نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مفتوحہ اراضی کے معاملے میں حسب موقع وضرورت مختلف مواقع پر مختلف فیصلے فرمائے تھے۔ بنی نضیر، بنی قریظہ، خیبر، فدک، وادی القریٰ، مکہ اور طائف کی مفتوحہ اراضی میں سے ہر ایک کا بندوبست، عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں الگ الگ طریقوں سے کیا گیا تھا اور ایسا کوئی ضابطہ نہیں بنایا گیا تھا کہ آئندہ ایسی اراضی (مفتوحہ) کا بندوبست لازماً فلاں طریقے یا طریقوں ہی پر کیا جائے۔ اس لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے اراضی مفتوحہ کا جو بندوبست کیا، اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں ردوبدل کی مثال نہیں قرار دیا جاسکتا۔"[3]

---

1 مسئلہ اجتہاد: ص 202

2 احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت: ص 186

3 مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، سنت کی آئینی حیثیت: ص 183، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، 2003ء

اراضی سے متعلق رسول اکرم ﷺ کا طریق کار

اراضی کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کے مختلف فیصلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مجیب اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 2006ء) نے لکھا ہے:

"غیر منقولہ جائیدادوں میں قرآن کے دیئے ہوئے اختیار کے مطابق آپ ﷺ کا طرز عمل حالات و مصالح کے پیش نظر مختلف مواقع پر مختلف رہا۔ کبھی آپ ﷺ نے کسی جائیداد کے بعض حصے کو تقسیم کیا اور بعض کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کی کفالت کے لیے مخصوص فرمایا لیا اور کسی جائیداد کو مہمانوں، مسافروں اور وفود کے اخراجات کے لیے خاص فرما دیا۔ غرض ضرورت و مصلحت کے مطابق آپ ﷺ اس میں تصرف فرماتے تھے اس لیے کہ قرآن کی ہدایت میں یہ وسعت موجود تھی۔"[1]

اراضی سے متعلق نبی اکرم ﷺ نے مختلف اوقات میں جو طریق کار اپنایا۔ اس کا اجمالی تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

مدینہ میں سب سے پہلے اراضی آپ ﷺ کو انصار نے دی تھی۔ اس کو آپ ﷺ وقتاً فوقتاً ضرورت مند مسلمانوں کو زراعت وغیرہ کے لیے عنایت فرمایا کرتے تھے۔ بعد ازاں مہاجرین نے انہیں انصار کو واپس لوٹا دیا تھا۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَمَّا فَرَغَ مِنْ قِتَالِ أَهْلِ خَيْبَرَ، فَانْصَرَفَ إِلَى الْمَدِينَةِ، رَدَّ الْمُهَاجِرُونَ إِلَى الْأَنْصَارِ مَنَائِحَهُمُ الَّتِي كَانُوا مَنَحُوهُمْ مِنْ ثِمَارِهِمْ،[2]

"جب رسول اللہ ﷺ اہل خیبر سے جنگ کے بعد مدینہ تشریف لائے تو مہاجرین نے انصار کو ان کے وہ عطیات واپس کر دیئے جو وہ انہیں پھلوں وغیرہ سے دیتے تھے۔"

غزوہ احد کے موقع پر ایک صحابی سیدنا مخریق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو اپنے چھ ذاتی باغات ہبہ کر دیئے تھے۔ اس آمدنی کو آپ ﷺ نے عام مسلمانوں کے لیے وقف فرما دیا تھا۔[3] واضح رہے کہ مخریق یا محریق کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ مسلمان تھے یا یہودی۔ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بعد اسلام لائے تھے اور غزوہ احد میں زخمی ہو کر شہید ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے ایثار

---

1 ندوی، محمد مجیب اللہ، اجتہاد اور تبدیلی احکام: ص 91، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ، لائبریری، لاہور

2 البخاري، أبو عبد الله، محمد بن إسماعيل، صحيح البخاري، كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها، باب فضل المنيحة: 2630، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الثانية، 1999م

3 باشميل، محمد أحمد، موسوعة الغزوات الكبرىٰ، غزوة أحد: ص 226-231، المكتبة السلفية، القاهرة، الطبعة الخامسة، 1406هـ

و قربانی اور خلوص کی بناء پر کہا: مخریق سائق یہود، مخریق یہود کو اسلام کی طرف لانے والوں میں ہیں اور خود آگے جانے والوں میں ہیں۔"[1]

جب یہود مدینہ بنی نضیر کی جائیداد آپ ﷺ کے قبضے میں آئی تو آپ ﷺ نے کچھ حصہ مہاجرین میں تقسیم کر دیا اور اس کا کچھ حصہ اپنے اہل و عیال کے لیے مخصوص فرمالیا۔ اسی میں سے دینی ضروریات اور جہاد کے سامان کی تیاری کے لیے مال خرچ کیا جاتا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

"فأما بنوا النضير فكانت حبسا لنوائبه."[2]

"بنو نضیر کی جائیداد ان دینی و دنیاوی ضروریات کے لیے مخصوص تھی جو آپ ﷺ کو پیش آتی رہتی تھیں۔"

بنو قریظہ کی جائیداد جب آپ ﷺ کے قبضہ میں آئی تو خمس نکالنے کے بعد آپ نے اس کو عام مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ امام زہری رحمہ اللہ (متوفی 124ھ) کا کہنا ہے:

"أقسمها رسول الله ﷺ بين المسلمين علي السهام."[3]

"بنو قریظہ کی جائیداد کو رسول اکرم ﷺ نے عام مسلمانوں میں حصہ کے مطابق تقسیم فرمادیا۔"

غزوہ خیبر کے موقع جو اراضی مسلمانوں کے زیر قبضہ آئی، اسے رسول اکرم ﷺ نے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ سنن ابو داؤد میں ہے:

«قسم رسول الله ﷺ خيبر نصفين نصفا لنوائبه و حاجته ونصفا بين المسلمين قسمها بينهم.»[4]

"رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی سرزمین کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا۔ نصف حصہ ہنگامی اور اپنی دوسری ضروریات کے لیے رکھا اور نصف حصہ مسلمانوں میں تقسیم فرمادیا۔"

خیبر کے بعد فدک اور وادی القریٰ کی اراضی نبی اکرم ﷺ کے قبضہ میں آئی۔ یہ بغیر جنگ کے حاصل ہوئی تھی اس لیے آپ ﷺ نے اس میں سے مخصوص مسلمانوں کو کوئی حصہ نہیں دیا بلکہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے قبضہ و نگرانی میں رکھا۔ مگر اس کی ساری آمدنی مسافروں اور مہمانوں پر صرف

---

[1] اجتہاد و تبدیلی احکام: ص 91

[2] السجستاني، أبو داؤد، سليمان بن الأشعث، سنن أبي داؤد، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في صفايا رسول الله ﷺ من الأموال: 2967، قال الألباني هذا الحديث حسن الإسناد، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

[3] البلاذري، أحمد بن يحيٰ بن جابر، فتوح البدان :1/ 31، دار ومكتبة الهلال، بيروت، الطبعة الأولى، 1988م

[4] سنن أبي داؤد، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب ما جاء في حكم أرض خيبر: 3010، قال الألباني هذا الحدث حسن صحيح

فرماتے تھے۔ فتوح البلدان میں ہے:

"وكان يصرف ما يأتيه منها إلى أبناء السبيل."[1]

"جو کچھ اس سے آمدنی ہوتی تھی اس کو آپ مسافروں پر صرف فرماتے تھے۔"

بعد ازاں مکہ، طائف اور حنین فتح ہوئے لیکن کسی موقع پر بھی آپ ﷺ نے اراضی کو مجاہدین میں تقسیم نہیں فرمایا۔

تقسیم اراضی مسلم حکمران کی صوابدید پر ہے

رسول اللہ ﷺ کے اس تمام تر متنوع طرز عمل سے یہ اصول اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مفتوحہ اراضی کی تقسیم مسلم حکمران کی صوابدید پر ہے کہ وہ جہاں مصلحت وضرورت کا تقاضا دیکھے وہاں اسے استعمال کرے۔ قرآن کریم سے بھی اسی تصور کی تائید ہوتی ہے اور نبی مکرم ﷺ کا طرز عمل بھی قرآن کی ہدایات ہی پر مبنی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾[2]

"جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دوسری بستی والوں سے رسول کو دلوایا ہے اس میں خدا کا حق ہے اور رسول کا حق ہے، اور قربتداروں اور یتیموں کا حق ہے اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے تاکہ وہ تمہارے چند دولت مندوں کے درمیان گردش نہ کرنے لگے جو کچھ رسول تم کو دیں وہ لے لو اور جس چیز سے تم کو روک دیں روک جاؤ اور اس بارے میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔"

اس کے بعد پھر فقراء ومہاجرین کا تذکرہ ہے اور پھر بعد میں آنے والوں کا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال اور جائیدادوں کی تقسیم میں یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ یہ محض دولت مندوں میں گردش نہ کرتی رہے اور دوسرے لوگ بالکل محروم نہ رہ جائیں۔

پھر یہ ہدایت کی گئی ہے کہ رسول اکرم ﷺ جس طرح تقسیم کر دیں اس پر راضی ہونا چاہیے کہ آپ کو بحیثیت سربراہ ریاست یہ اختیار حاصل ہے کہ حسب ضرورت ومصلحت جیسے چاہیں دیں اور جسے چاہیں نہ دیں۔

آخر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اس میں بعد میں آنے والے مسلمانوں کا بھی حصہ ہے۔ یہ صرف موجودہ مسلمانوں کا حصہ نہیں بلکہ تاقیامت آنے والے مسلمان اس میں شریک ہیں۔

---

[1] فتوح البلدان: 1/ 38

[2] سورة الحشر: 59: 7

انہی قرآنی ہدایات کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر حسب مصلحت وضرورت مختلف طریق عمل اختیار فرمایا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا استدلال

چنانچہ سواد عراق کی تقسیم کے موقع پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی درحقیقت قرآن کی اسی آیت کو مدار استدلال بنایا، جس کے تحت رسول اللہ ﷺ نے اراضی کے مختلف انتظامات فرمائے تھے۔ چنانچہ ﴿کی لایکون دولة بین الأغنیاء منکم﴾[1] سے استدلال کرتے ہوئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا کہ

"لوقسمتها بینهم لصارت دولة بین الاغنیاء منکم ولم یکن لمن جاء بعدهم من المسلمین وقد جعل لهم فیها الحق بقوله والذین جاءوا من بعدهم."[2]

"اگر میں اس اراضی کو اہل لشکر میں تقسیم کردوں تو یہ سرزمین چند دولت مندوں کی جاگیر ہو کر انہی میں گردش کرتی رہے گی اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کو اس میں سے کچھ بھی نہ ملے گا حالانکہ اللہ نے ان کا حصہ بھی رکھا ہے، چنانچہ فرمایا ہے کہ "اور جو لوگ ان کے بعد آئیں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا استدلال قرآنی ہدایات اور اسوۂ رسول اللہ ﷺ کے عین مطابق مصلحت پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس لیے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور اجماعی طور پر ان زمینوں کو تقسیم نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔[3]

لہٰذا اس سے یہ استدلال درست نہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کسی منصوص حکم میں تبدیلی کی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مسئلہ سے متعلق متعدد منصوص احکام میں سے ایک حکم کا اطلاق کیا ہے۔

دوسرا مسئلہ: قطع ید کی منسوخی

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے جن اقدامات کو منصوص احکام میں تبدیلی کے جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چوری کی سزا قطع ید منسوخ کر دی تھی۔ جناب غلام احمد صاحب پرویز عہد رسالت مآب ﷺ و عہد صدیقی رضی اللہ عنہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اختلافی فیصلے گنواتے ہوئے چوتھے نمبر پر اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانے میں چوری کی سزا موقوف کر دی۔"[4]

---

[1] سورة الحشر: 7:59

[2] الجصاص، أحمد بن علي، أحكام القرآن: 3/ 575، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1994م

[3] الجصاص ،احکام القرآن :5/ 319

[4] شاہکار رسالت: ص279

مولانا محمد تقی امینی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

"بھوک قحط کے عام ابتلاء میں قطع ید سے روک دیا جب کہ قرآن حکیم کی آیت

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا أَيْدِيَهُمَا﴾[1]

"چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت، ان کے ہاتھ کاٹ دو۔" عام ہے، جس میں کسی خاص صورت کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔"[2]

مولانا محمد حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ[3]، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری رحمۃ اللہ علیہ[4] نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

تجزیہ استدلال

یہ واقعہ تاریخ کی تقریبا تمام معتبر کتابوں میں موجود ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک ہلاکت آفرین قحط بپا ہوا تھا اور جناب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے زمانہ قحط میں 'حد سرقہ' پر عملدرآمد روک دیا تھا۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 174ھ) کے حسب تصریح یہ قحط 18 ہجری میں پڑا تھا۔[5]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا چوری کی سزا یعنی قطع ید کے قرآنی حکم پر عملدرآمد کو روک دینے کا سبب اور وجہ کیا تھی؟ اور کیا اس سے یہ اصول اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حاکم وقت کو تبدیلی حالات کی بناء پر منصوص شرعی احکام میں تبدیلی کا حق حاصل ہے، اس ضمن میں نکات ذیل پر غور کرنا ضروری ہے:

1. قرآن کریم میں چوری کی سزا کے حکم کی نوعیت کیا ہے؟
2. اقامت حدود خصوصاً حد سرقہ کے باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کیا تھا؟
3. سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اقدام کن حالات میں اٹھایا تھا؟

ان نکات کے تجزیہ و تحلیل سے مسئلہ کی اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔

پہلا نکتہ: قطع ید کے قرآنی حکم کی نوعیت

چوری کی سزا سے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا أَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا﴾[6]

---

1 سورة المائدة: 5: 38

2 احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت: ص 182

3 مسئلہ اجتہاد: ص 203

4 اجتہادی مسائل: ص 20

5 ابن كثير، أبو الفداء، إسماعيل بن عمر بن كثير، البداية والنهاية: 7/ 67، دار هجر للطباعة والنشر والتوزيع، الطبعة الأولى، 1997م

6 سورة المائدة: 5: 38

"چوری کرنے والے مرد وعورت کے ہاتھ کاٹ دیا کرو یہ بدلہ ہے اس کا جو انہوں نے کیا۔"

یہ فرمان نقل اور ثبوت کے اعتبار سے تو قطعی اور یقینی ہے، لیکن مفہوم و مراد کے پہلو سے اس میں کئی احتمالات موجود ہیں گویا یہ قطعی الثبوت اور ظنی الدلالۃ ہے، لہذا اس عام حکم کی تخصیص و تقیید ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چند حرفیت پسند ارباب فقہ کو چھوڑ کر اہل علم کی عظیم اکثریت اسی کی قائل ہے۔ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں حافظ صلاح الدین صاحب یوسف حفظہ اللہ تحریر کرتے ہیں:

"بعض ظاہری فقہاء کے نزدیک سرقے کا یہ حکم عام ہے، چوری تھوڑی سی چیز کی ہو یا زیادہ کی۔ اسی طرح وہ حرز (محفوظ جگہ) میں رکھی ہو یا غیر حرز میں۔ ہر صورت میں چوری کی سزا دی جائے گی۔ جب کہ دوسرے فقہاء اس کے لیے حرز اور نصاب کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ پھر نصاب کی تعیین میں ان کے مابین اختلاف ہے۔ محدثین کے نزدیک نصاب ربع دینار یا تین درہم (یا ان کے مساوی قیمت کی چیز) ہے۔ اس سے کم چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح ہاتھ رسغ (پہنچوں) سے کاٹے جائیں گے۔ کہنی یا کندھے سے نہیں۔ جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔"[1]

واضح رہے کہ اس قرآنی حکم کی تخصیص و تقیید دیگر شرعی نصوص ہی کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مخصصات و مبنیات سے صرف نظر کر کے محض ظاہر آیت کی بناء پر اس کا مفہوم و معنی متعین نہیں کیا جا سکتا۔ حد سرقہ سے متعلق جزوی تفصیلات تو بہت سی ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن یہاں ایک اہم پہلو کے بارے میں اشارہ ضروری ہے۔ جس کا تعلق اگرچہ عمومی طور پر تمام ہی حدود سے ہے لیکن مسئلہ زیر بحث میں وہ بہت اہم ہے۔ اس سے مقصود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

«ادراوا الحدود عن المسليمن ما استطعتم فان كان له مخرج فخلوا سبيله فان الامام ان يخطئ في العفو خير من ان يخطئ في العقوبة.»[2]

"جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں سے حدود کو ہٹاؤ، اگر کسی کے لیے کوئی گنجائش پاؤ تو اس کی راہ چھوڑ دو۔ حکمران کا معافی میں غلطی کرنا، سزا دینے میں خطا سے بہتر ہے۔"

اس سلسلہ میں یہ حدیث بھی پیش کی جاتی ہے:

«ادراوا الحدود بالشبهات.»

---

[1] یوسف، صلاح الدین، حافظ، تفسیر احسن البیان: ص302، دار السلام پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، لاہور، طبع چہارم، 1998ء

[2] الترمذي، أبو عيسى، محمد بن عيسى، جامع الترمذي ،كتاب الحدود ،باب ماجاء في درء الحدود: 1424، قال الألباني هذا الحديث ضعيف، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

لیکن یہ حدیث مرفوعاً ثابت نہیں ہے۔ امام زیلعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 762ھ) نے ان الفاظ کے ساتھ اسے غریب قرار دیا ہے۔[1]

تاہم اس سے جو اصول اخذ کیا جاتا ہے کہ شبہات کی بناء پر حدود ساقط ہو جاتی ہیں، وہ بہر آئینہ درست ہے کہ دیگر صحیح دلائل اس کے مؤید ہیں جیسا کہ اوپر بیان کردہ صحیح حدیث میں ہے مذکورہ حدیث تمام حدود کے لیے مخصص کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی حدیث کے پیش نظر علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ شبہ موجود ہو تو حد نہیں لگائی جائے گی۔ البتہ شبہ سے مراد کیا ہے اس باب میں ان کی آراء مختلف ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنے کا قرآنی حکم اپنے دامن میں عمومیت لئے ہوئے ہے، لیکن اس پر عمل کرتے ہوئے دیگر دلائل و براہین سے ثابت شدہ قیود و تخصیصات کو سامنے رکھنا ضروری ہے، جن میں سے ایک اہم قید یہ ہے کہ بوقت شبہ اس حد کا اطلاق و نفاذ نہیں کیا جائے گا۔

دوسرا نکتہ: اقامت حدود میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل

حدود کے نفاذ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں دوسروں کو شبہات کی بناء پر حدود کے نفاذ سے روکنے کی تلقین کرتے تھے بلکہ خود بھی ایسی صورت حال میں حد نہیں لگاتے تھے اور حتی الامکان شبہ کا فائدہ دے کر حد کو مؤخر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی طرح چوری کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ توضیح و تبیین بھی فرمائی کہ معمولی قسم کی اشیاء یا کھانے پینے کی چیزیں چرانے پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

ابو داؤد میں یہ واقعہ مرقوم ہے:

> ''ایک غلام نے کسی باغ سے کھجور کے چھوٹے پودے چرا کر اپنے آقا کے باغ میں لگا دیئے۔ اصل مالک کو پتہ چلا تو وہ غلام کو پکڑ کر امیر مدینہ مروان کے پاس لے آیا۔ مروان نے اسے قید کر کے ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کر لیا۔ غلام کا مالک صحابی رسول سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور اس سے متعلق شرعی رہنمائی چاہی۔ سیدنا رافع رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنایا: «لا قطع في ثمر ولا كثر.» ''پھل اور کھجور کے شگوفے کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔'' اس نے عرض کیا کہ آپ مروان کے پاس جا کر یہی حدیث سنا دیں۔ سیدنا رافع رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ مروان نے اس غلام کو چھوڑ دیا۔''[2]

---

[1] الزيلعي، جمال الدين، أبو محمد عبد الله بن يوسف، نصب الراية لأحاديث الهداية: 3/ 333، مؤسسة الريان للطباعة والنشر، بيروت، الطبعة الأولى، 1997م

[2] سنن أبي داؤد ،كتاب الحدود ،باب مالاقطع فيه: 4388، قال الألباني هذا الحديث صحيح

اسی طرح سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درختوں میں لگے ہوئے پھلوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

«مَنْ أَصَابَ بفيه مِنْ ذِي حَاجَةٍ غَيْرَ مُتَّخِذٍ خُبْنَةً، فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ، وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ فَعَلَيْهِ غَرَامَةُ مِثْلَيْهِ وَالْعُقُوبَةُ، وَمَنْ سَرَقَ مِنْهُ شَيْئًا بَعْدَ أَنْ يُؤْوِيَهُ الْجَرِينُ، فَبَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ، فَعَلَيْهِ الْقَطْعُ، وَمَنْ سَرَقَ دُونَ ذَلِكَ فَعَلَيْهِ غَرَامَةُ مِثْلَيْهِ، وَالْعُقُوبَةُ.»[1]

اگر بھوک سے مجبور ہو کر کوئی شخص کھانے پینے کی چیز چرا لیتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے سزا نہ دیتے تھے۔ قبیلہ بنی غبر کے ایک صحابی سیدنا عبادہ بن شرحبیل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"ہمارے علاقے میں قحط پڑ گیا تو میں بھوک سے مجبور ہو کر مدینہ کے ایک باغ میں گھس گیا اور وہاں سے کچھ خوشے توڑ کر کھا لیے اور کچھ اپنے کپڑے میں باندھ لیے۔ اتنے میں باغ کا مالک نکلا۔ اس نے مجھے مارا اور میرا کپڑا بھی چھین لیا۔ میں رسول اللہ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور سارا قصہ ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باغ کے مالک سے فرمایا: «ما اطعمته إذا كان جائعا أو ساغبا ولا علمته إذا كان جاهلا.» "اگر یہ بھوکا تھا تو تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا اور اگر یہ نادان تھا تو اسے تو نے تعلیم نہیں دی۔" بعد ازاں اسے کپڑا واپس کرنے کا حکم دیا اور سیدنا عبادۃ رضی اللہ عنہ کو ایک نصف وسق غلہ دینے کا حکم دیا۔"[2]

نگہ بازگشت

حد سرقہ سے متعلق قرآنی ہدایت اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار سے درج ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

1. چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم عام ہے جس کی تخصیص و تقیید احادیث و سنت میں ہے۔
2. قرآنی حکم پر عمل کرتے ہوئے اس کے مخصصات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔
3. شبہ کی صورت میں حدود ساقط ہو جاتی ہیں۔
4. نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چوری کا ایک نصاب مقرر فرمایا ہے، جو اگر پورا نہ ہو تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی بناء پر کھانے پینے اور معمولی نوعیت کی اشیاء میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ نہ کاٹنے کی تلقین کی ہے۔
5. اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو کر کھانے کی کوئی شے چرا لیتا ہے تو اس پر حد سرقہ لاگو نہ ہو گی۔

---

[1] سنن أبي داؤد ،كتاب الحدود ،باب مالا قطع فيه: 4390، قال الألباني هذا الحديث حسن

[2] القزويني، أبو عبد الله محمد بن يزيد، سنن ابن ماجة ، كتاب التجارات، باب من مر على ماشية قوم أوحائط هل يصيب منه: 2298، قال الألبانى هذا الحديث صحيح، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

تیسرا نکتہ: حد سرقہ سے متعلق اقدام فاروقی کا پس منظر

مندرجہ بالا امور ذہن میں رکھتے ہوئے اب ایک نظر ان حالات پر بھی ڈال لینی چاہیے جن میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا پر عملدرآمد روک دیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں سن 18/ ہجری میں ایک انتہائی آفرین قحط بپا ہوا تھا جس سال قحط پڑا اسے "عام الرمادۃ" کہا جاتا ہے۔ اس قحط نے پورے جزیرہ عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اس کا سلسلہ تقریباً نو ماہ تک جاری رہا۔

'عام الرمادۃ' کی وجہ تسمیہ

اس قحط کی ہلاکت خیزی ہی کی بناء پر اس کا نام "عام الرمادۃ" رکھا گیا، جس سال میں یہ قحط بپا ہوا تھا۔ "الرمادۃ" رمد سے نکلا ہے، جس کی معنی ہلاک کرنے کے ہیں۔ راکھ کو "الرمادۃ" کہا جاتا ہے۔

علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 630ھ) نے لکھا ہے:

"وقيل سمي به لانهم لما اجدبوا صارت الوانهم كلون الرماد. "[1]

"کہا جاتا ہے کہ اس سال کا نام "عام الرمادۃ" اس لیے رکھا گیا ہے جب لوگ قحط کی زد میں آئے تو ان کے رنگ راکھ کی مانند ہو گئے۔"

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 855ھ) اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سمي العام بها لما حصل من شدة الجدب فاغبرت الأرض من عدم المطر. "[2]

"اس سال کا نام "عام الرمادۃ" رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ جب قحط اور خشک سالی کی شدت ہوئی تو زمین میں ہر طرف گرد و غبار اور خاک اڑنے لگی کیونکہ بارش نہیں ہو رہی تھی۔"

امام ابو عبید الھروی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 838ھ) "عام الرمادۃ" کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتے ہیں:

"إنما سمي الرمادة لان الزرع والشجر والنخل وكل شيء من النبات احترق مما اصابته السنة فشبه سواد بالرماد. "[3]

"اس برس کو "الرمادۃ" اس لیے کہا گیا ہے کہ کھیت، درخت، باغات غرضیکہ زمین سے اگنے والی ہر شے قحط کی

---

[1] ابن الأثير، مجد الدين أبو السعادات المبارك بن محمد، النهاية في غريب الحديث والأثر: 2/ 262، المكتبة العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1399هـ

[2] العينى، بدر الدين، أبو محمد محمود، عمدة القارى: 7/ 47، دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى، 1421هـ

[3] البغدادي، أبو عبيد القاسم بن سلام، غريب الحديث: 3/ 212، مطبعة دائرة المعارف العثمانية، حيدر آباد، الطبعة الأولى، 1964م

بناء پر جل کر رہ گئی تھی لہٰذا اس کی سیاہی کو راکھ سے تشبیہ دی گئی ہے۔"

زمانہ قحط میں لوگوں کی حالت

اس قحط نے لوگوں پر کیا قیامت ڈھائی، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"كان عام الرمادة في آخر سنة سبع عشرة وأول سنة ثماني عشرة، أصاب أهل المدينة وما حولها جوع فهلك كثير من الناس، حتي جعلت الوحش تاوي الي الانس."[1]

"عام الرمادۃ 17 ہجری سے آخر اور 18ھ کے آغاز میں تھا اس زمانے میں اہل مدینہ اور ارد گرد کے لوگ قحط کی زد میں آئے جس کی شدت سے بہت سے لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ اس کی سنگینی کا عالم یہ تھا کہ وحشی درندے بھی گھبرا کر انسانوں کے پاس پناہ لیتے تھے۔"

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی کیفیت

جو لوگ رزق خاک بننے سے بچ گئے، ان کے رنگ بھوک کی شدت سے سیاہ پڑ گئے تھے۔ خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایثار کا مظاہرہ کیا اور گوشت گھی دودھ وغیرہ چھوڑ دیا۔ اس سے آپ کا رنگ بھی کالا ہو گیا۔ امام ابن ہبۃ اللہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 571ھ) نے لکھا ہے:

"وكان عمر بن الخطاب شديد البياض وكان ياكل السمن واللبن فلما امحل الناس حرمهما علي نفسه عام الرمادة قال والله لا اكلهما حتي يخصب الناس وكان ياكل الزيت حتي تغير لونه."[2]

"سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی رنگت انتہائی سفید تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ گھی اور دودھ استعمال کرتے تھے لیکن جب لوگ قحط میں مبتلا ہو گئے تو "عام الرمادۃ" میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور فرمایا: میں اس وقت تک دودھ اور مکھن نہیں کھاؤں گا جب تک لوگ خوشحال نہیں ہو جاتے اور ان میں اشیائے خورد و نوش کی ارزانی نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد انہوں نے روغن زیتون کھانا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کی رنگت تبدیل ہو گئی۔"

امام فسوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 890ھ) نے "المعرفة التاريخ" میں تحریر کیا ہے:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ انتہائی سرخ و سپید تھے لیکن زمانہ قحط میں انہوں نے گوشت اور گھی چھوڑ کر زیتون کا تیل استعمال

---

[1] البداية والنهاية: 7/ 104

[2] ابن عساكر، أبو القاسم علي بن الحسن، تاريخ دمشق: 44/ 18، دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، عام النشر، 1995م

کرنا شروع کر دیا تھا، جس سے ان کی رنگت میں تغیر واقع ہو گیا تھا۔"[1]

قحط کے سلسلے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس قدر پریشان تھے کہ ان کے غلام اسلم فرماتے ہیں:

"ہمیں اندیشہ تھا کہ اگر قحط کا خاتمہ نہ ہوا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ شدت غم سے انتقال کر جائیں گے۔"[2]

قحط سے نمٹنے کے لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی

اس ہلاکت آفرین قحط سے نمٹنے کے لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے متعدد اقدامات کیے:

1. مختلف علاقوں کے حکام کو خطوط لکھے کہ وہ اہل حجاز کے لیے غلہ وغیرہ کی صورت میں امداد روانہ کریں۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وكتب إلى أمراء الأمصار أن أغيثوا أهل المدينة ومن حولها فإنه قد بلغ جهدهم."[3]

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف علاقوں کے امراء کو خط لکھا کہ وہ اہل مدینہ اور دیگر قحط زدگان کے لیے امداد روانہ کریں کیونکہ وہ سخت مصیبت و مشقت میں مبتلا ہیں۔"

چنانچہ علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 808ھ) کے حسب تصریح سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ چار ہزار اونٹ غلے کے لے کر مدینہ پہنچے اور سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بحر قلزم کے راستے، مصر سے غلہ بھیجا۔[4]

2. سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کھاتے پیتے گھرانوں میں فقراء اور مساکین کے کھانے کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ علامہ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 795ھ) نے لکھا ہے:

"وكان عمر في عام الرمادة يدخل علي أهل البيت من المسلمين مثلهم، ويقول: لن يهلك امرؤ وعنده نصف قوته."[5]

"عام الرمادۃ" کے دوران سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہر گھر میں اتنے افراد بھیج دیتے تھے، جتنے افراد پہلے

---

[1] الفسوي، يعقوب بن سفيان، المعرفة والتاريخ: 3/ 308، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية، 1981م

[2] الذهبي، شمس الدين أبو عبد الله، تاريخ الإسلام ووفيات المشاهير والأعلام: 1/ 796، دار الغرب الإسلامي، الطبعة الأولى، 2003م

[3] البداية والنهاية: 7/ 104

[4] ابن خلدون، عبد الرحمن بن محمد بن محمد، تاريخ ابن خلدون: 2/ 114، دار الفكر، بيروت، الطبعة الثانية، 1988م

[5] ابن رجب، زين الدين، عبد الرحمن بن أحمد، فتح الباري شرح صحيح البخاري:5/ 167، مكتبة الغرباء الأثرية، المدينة النبوية، الطبعة الأولى، 1996م

وہاں موجود ہوتے تھے اور فرماتے تھے کہ انسان آدھی غذا سے ہلاک نہیں ہوتا۔"

یعنی ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کافی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا یہ عمل حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«طَعَامُ الْوَاحِدِ يَكْفِي الِاثْنَيْنِ، وَطَعَامُ الِاثْنَيْنِ يَكْفِي الْأَرْبَعَةَ، وَطَعَامُ الْأَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ.»[1]

"ایک فرد کا کھانا دو کے لیے کافی ہے، دو کا چار کے لیے اور چار کا کھانا آٹھ افراد کے لیے کفایت کرتا ہے۔"

علامہ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 795ھ) کے مطابق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام اسی حدیث نبوی سے ماخوذ ہے۔[2]

3. سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں پر تخفیف کرتے ہوئے قحط کے سال زکوۃ وصول نہیں کی کہ لوگوں کے پاس پہلے ہی کھانے کے لیے کچھ نہ تھا، زکوۃ کیسے دیتے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 516ھ) لکھتے ہیں:

"أن عمر أخر الصدقة عام الرمادة، فلما أحيا الناس في العام المقبل، أخذ منهم صدقة عامين."[3]

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے "عام الرمادۃ" میں زکوۃ مؤخر کر دی، پھر جب آئندہ برس لوگوں کی حالت بہتر ہوئی تو ان سے دو سال کی زکوۃ وصول کی۔"

4. خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مدینہ کے لوگوں میں راشن تقسیم کرتے اور اپنی نگرانی میں بھوکوں کو کھانا کھلاتے۔ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1914م) نے لکھا ہے:

"ہر روز بیس اونٹ ذبح کر کے پکواتے اور لوگوں کو کھلاتے۔"[4]

حد سرقہ کا موقوف کرنا

یہ تھے وہ حالات جن میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چوری کی سزا 'قطع ید' پر عملدرآمد روک دیا تھا۔ اور ایسی صورتحال میں یہ اقدام قرآنی تعلیمات اور اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق تھا۔ اس لیے کہ اس طرح کے حالات میں انسان مجبور و مضطر ہو جاتا ہے اور قرآن میں یہ اجازت دی گئی ہے کہ حالت اضطرار میں حرام اشیاء بھی کھائی جا سکتی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

---

[1] النيسابوري، مسلم بن الحجاج القشيري، صحيح مسلم ،كتاب الأشربة، باب فضيلة المواساة في الطعام القليل:2059، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1998م

[2] فتح الباری لابن رجب:3/ 384

[3] البغوي، أبو محمد حسين بن مسعود، شرح السنة:6/ 35، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية، 1983م

[4] نعمانی، شبلی، مولانا، الفاروق:298، دار الاشاعت اردو بازار، کراچی، طبع اول، 1991ء

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾[1]

"پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے قرار ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقینا اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بہت بڑا مہربان ہے۔"

چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن کے قانون اضطرار اور دیگر تعلیمات کے پیش نظر چوروں کے ہاتھ کاٹنے سے پرہیز فرمایا۔ علامہ ابن القیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 751ھ) نے لکھا ہے:

"فإن السنة إذا كانت سنة مجاعة وشدة غلب على الناس الحاجة والضرورة فلا يكاد يسلم السارق من ضرورة تدعوه إلي ما يسد به رمقه."[2]

"قحط کے زمانے میں فقر و فاقہ کی شدت عام آدمیوں کو اتنا مجبور اور ضرورت مند بنا دیتی ہے کہ چور کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ سد رمق کے لیے چوری سے محفوظ رہ سکے۔"

شبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے

پھر جیسا کہ پہلے بیان ہوا، حدیث کی رو سے اگر شبہ پایا جائے تو حد نہیں لگائی جائے گی۔ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قحط کی صورتحال ایک قوی شبہ تھی کہ چرانے والے نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کی ہے، ورنہ عام حالات میں شاید وہ چوری نہ کرتا۔ امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے بقول:

یہ شبہ انتہائی قوی ہے لہذا محتاج کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ فقہاء نے جو دیگر شبہات پیش کئے ہیں، یہ ان سب سے زیادہ قوی ہے۔[3] انہوں نے مزید لکھا ہے:

"هو مأذون له في مغالبة صاحب المال علي أخذ ما يسد رمقه، وعام المجاعة يكثر فيه المحاويج والمضطرون، ولا يتميز المستغني منهم والسارق لغير حاجة من غيره، فاشتبه من يجب عليه الحد بمن لا يجب عليه، فدري، نعم إذا بان أن السارق لا حاجة به وهو مستغن عن السرقة قطع."[4]

"چور کو ڈھیل صرف ان دولت مندوں کے مقابلہ میں دی گئی ہے کہ وہ اس طرح ان کا مال لے کر اپنے جسم وجان کے رشتہ کو قائم رکھ سکے۔ قحط کے زمانے میں ضرورت مندوں، بھوکوں اور مجبوروں کی کثرت ہوتی ہے اور ان حالات میں یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہوتا ہے کہ کون مستغنی ہونے کی بنا پر مستوجب حد ہے اور کون

---

[1] سورة المائدة 5:3

[2] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر، إعلام الموقعين عن رب العالمين:3/ 17، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1991م

[3] أيضاً

[4] إعلام الموقعين:352/4

ضرورت مند ہے۔ لہٰذا حد کو مؤخر کر دیا گیا۔ البتہ جب یہ واضح ہو جائے کہ چور کو ضرورت نہ تھی بلکہ وہ چوری سے مستغنی تھا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔"

ڈاکٹر محمد بن عبد الرحمن القناص ایک سوال کے جواب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کی توجیہ میں لکھتے ہیں:

"وما جاء عن عمر في عام الرمادة ليس من باب تعطيل حد السرقة، بل هو من باب درء الحدود بالشبهات، وهذه قاعدة في إقامة الحدود أنها تدفع بالشبهات، لأنه في عام الرمادة عمت المجاعة، وكثر المحاويج والمضطرون، فيصعب التمييز بين من يسرق من أجل الحاجة والضرورة، ومن يسرق وهو مستغن، ولهذا أسقط عمر القطع في عام المجاعة." [1]

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے متعلق جو مروی ہے کہ "عام الرمادۃ" میں انہوں نے حد سرقہ پر عملدرآمد سے روک دیا تھا تو اس سے مراد یہ نہیں کہ انہوں نے چوری کی حد معطل کر دی تھی بلکہ یہ شریعت کے اس اصول پر مبنی ہے کہ شبہات کی بناء پر حدود کو مؤخر کر دو۔ اس لیے کہ "عام الرمادۃ" میں قحط سالی نے ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لیے لیا تھا اور حاجت مند اور اہل اضطرار بہت کثرت سے موجود تھے۔ لہٰذا یہ امتیاز کرنا دشوار تھا کہ کون ضرورت وحاجت کی بناء پر سرقہ کا مرتکب ہوا ہے اور کس نے استغناء کے باوجود اس فعل شنیع کا ارتکاب کیا ہے۔ اس وجہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانہ میں حد ساقط کر دی تھی۔"

حاصل کلام یہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چوری کی حد پر عملدرآمد اس لیے روکا تھا کہ خود شریعت نے ایسی حالت میں حد نافذ کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق حالت شبہ میں حد لاگو نہیں ہو سکتی۔ اس بناء پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے یہ استدلال درست نہیں کہ انہوں نے حالات وظروف کی بناء پر ایک شرعی حکم میں تبدیلی کر دی تھی اور یہ کہ آج بھی ارباب حل وعقد کو ایسا کرنے کا اختیار ہے۔

تیسرا مسئلہ: مجلس واحد کی تین طلاقوں کو تین قرار دینا

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے جن اقدامات کو تبدیلی احکام کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں اگر کوئی شخص ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دیتا تو اسے ایک طلاق شمار کیا جاتا، لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں تین ہی شمار کرنا شروع کر دیا۔ مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ تغیر احکام کی مثالیں دیتے ہوئے اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

"اگر کوئی شخص ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسے ایک ہی

[1] علماء وطلبة علم، فتاوى واستشارات موقع الإسلام اليوم: 5/ 28، موقع الإسلام اليوم، www.islamtoday.net

طلاق متصور کیا جاتا تھا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یہی معمول رہا۔ خود سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت تک اسے طلاق رجعی ہی سمجھا گیا۔ لیکن جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ معاملہ شناس نے دیکھا کہ لوگ طلاق کے مسئلے کی پوری پوری اہمیت محسوس نہیں کرتے اور اسلام کی اس رخصت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس معمول کی مخالفت کی اور فیصلہ صادر فرمادیا کہ آئندہ یہ تین طلاقیں قطعی بینونت اور علیحدگی کو موجب ہوں گی اور رجوع کا حق نہیں دیا جائے گا۔"[1]

تجزیہ استدلال

سچ یہ ہے کہ بظاہر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام 'تبدیلی احکام' کی ایک قوی دلیل ہے۔ لیکن تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے اور معاملے کے پس منظر اور اس اقدام فاروقی کے اسباب ووجوہ کا کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ ذیل میں اس کی توضیح کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے وہ روایت دیکھنی چاہیے جس میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کا تذکرہ ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ، طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً، فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ قَدْ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ، فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ، فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ."[2]

"رسول اللہ ﷺ کے زمانے، سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو برسوں میں تین طلاق کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ جس معاملے (طلاق) میں لوگوں کو سوچ بچار سے کام لینا چاہیے تھا، اس میں وہ جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں۔ لہٰذا ہم کیوں نہ اس کو نافذ کر دیں، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کو ان پر نافذ کر دیا۔"

اقدام فاروقی رضی اللہ عنہ کا پس منظر

یہاں یہ سوال غور وفکر کی سطح پر ابھر کر سامنے آتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کا پس منظر کیا ہے؟ تامل کیا جائے تو اسی حدیث میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ کثرت سے طلاقیں دینے لگ گئے تھے، جب کہ شریعت نے اس میں انتہائی غور وفکر اور صبر و تحمل سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ اسلام میں اسے حلال وجائز امور میں سب سے ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

---

[1] مسئلہ اجتہاد: ص203، اس کا تذکرہ ڈاکٹر صبحی محمصانی نے فلسفہ شریعت اسلام: ص218، مولانا محمد تقی امینی نے احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت: ص180، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری نے اجتہادی مسائل: ص20 اور غلام احمد پرویز نے شاہکار رسالت: ص278 میں کیا ہے۔

[2] صحيح مسلم، كتاب الطلاق، باب الطلاق الثلاث: 1472

«أبغض الحلال إلي الله تعالىٰ الطلاق.»[1]

"حلال امور میں سے اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین طلاق ہے۔"

بیک وقت تین طلاق حرام ہیں

علاوہ ازیں اکٹھی تین طلاقیں دینا حرام اور ناجائز ہے۔ شریعت کی رو سے یہ سخت ناپسندیدہ فعل ہے۔ ایک طرف یہ نص قرآنی ﴿الطلاق مرتٰن﴾[2] "طلاق دو مرتبہ ہے" کے خلاف ہے تو دوسری جانب نبی مکرم ﷺ نے اسے «تلعب بكتاب الله» کتاب اللہ کے ساتھ کھیل قرار دیا ہے۔

سنن نسائی میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالیں۔ جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ بڑے غضبناک ہوئے اور فرمایا:

«أيلعب بكتاب الله وأنا بين أظهركم.»[3]

"کیا میری موجودگی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ تلعب (کھیل) کیا جا رہا ہے۔"

اس فرمان رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اکٹھی تین طلاقوں کو سخت مکروہ گردانتے تھے۔ جس شخص کے متعلق انہیں یہ پتہ چلتا کہ اس نے بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں تو اس کی پشت پر درے لگاتے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 852ھ) نے لکھا ہے:

"ان عمر كان إذا أتي برجل طلق امرأته ثلاثا أوجع ظهره."[4]

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کسی ایسے شخص کو لایا جاتا، جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہوتیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس کی پیٹھ پر کوڑے برساتے۔"

اس کے باوجود جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگ طلاق کے مسئلہ میں اس احتیاط و تدبر سے کام نہیں لیتے جو شریعت نے بتلایا ہے کہ حالت طہر میں ایک ہی طلاق دی جائے بلکہ بیک وقت تین طلاقیں کثرت سے دینے لگے ہیں جو شرعی احکام کی صریح خلاف ورزی ہے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ تین

---

[1] سنن أبي داؤد، كتاب الطلاق، باب كراهية الطلاق: 2178، قال الألباني هذا الحديث ضعيف

[2] سورة البقرة: 2: 229

[3] النسائي، أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب، سنن النسائي، كتاب الطلاق، باب الثلاث المجموعة وما فيه من التغليظ: 3401، قال الألباني هذا الحديث ضعيف، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

[4] العسقلاني، أبو الفضل أحمد بن علي بن حجر، فتح الباري شرح صحيح البخاري: 12/ 553، كتاب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة، 2000م

طلاقوں کو تین ہی شمار کرنے کا نفاذ کر دیا جائے تاکہ اس سخت اقدام سے لوگوں کو کچھ تنبیہ ہو اور کثرت سے بیک وقت تین طلاق دینے کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہو۔ اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ شریعت کے احکام کی نافرمانی اور بے حرمتی سے لوگوں کو روکا جائے۔

یہ فیصلہ فاروقی رضی اللہ عنہ تہدیدی اور سیاسی نوعیت کا تھا

یہ تھے وہ اسباب ووجوہ اور مصالح جن کی بناء پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تہدیدی وسیاسی آرڈیننس جاری کیا کہ اب جو شخص بیک وقت تین طلاقیں دے گا۔ اسے رجوع کا حق حاصل نہیں رہے گا بلکہ انہیں تین ہی شمار کیا جائے گا۔ یہ تمام تر صورتحال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے تھی اس لیے انہوں نے بالعموم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس سیاسی وتہدیدی اقدام پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ امام ابن القیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"رأى أمير المؤمنين عمر رضي الله عنه أن الناس قد استهانوا بأمر الطلاق، وكثر منهم إيقاعه جملة واحدة، فرأي من المصلحة عقوبتهم بإمضائه عليهم، ليعلموا أن أحدهم إذا أوقعه جملة بانت منه المرأة وحرمت عليه حتي تنكح زوجا غيره نكاح رغبة يراد للدوام لا نكاح تحليل، فإنه كان من أشد الناس فيه، فإذا علموا ذلك كفوا عن الطلاق المحرم، فرأى عمر أن هذا مصلحة لهم في زمانه، ورأى أن ما كانوا عليه في عهد النبي ﷺ وعهد الصديق، وصدرا من خلافته كان الأليق بهم، لأنهم لم يتتابعوا فيه وكانوا إن يتقون الله في الطلاق، وقد جعل الله لكل من اتقاء مخرجا، فلما تركوا تقوي الله وتلاعبوا بكتاب الله وطلقوا علي غير ما شرعه الله ألزمهم بما التزموه عقوبه لهم، فإن الله تعالي إنما شرع الطلاق مرة بعد مرة ولم يشرع كله مرة واحدة، فمن جمع الثلاث في مرة واحدة فقد تعدي حدود الله وظلم نفسه ولعب بكتاب الله، فهوحقيق أن يعاقب، ويلزم بما التزمه، ولا يقر علي رخصة الله وسعته، وقد صعبها علي نفسه، ولم يتق الله ولم يطلق كما أمره الله وشرعه له، بل استعجل فيما جعل الله له الأناة فيه رحمة منه إحسانا، ولبس علي نفسه، واختار الأغلظ والأشد فهذا مما تغيرت به الفتوي لتغير الزمان، وعلم الصحابة رضي الله عنهم حسن سياسة عمر وتأديبه لرعيته في ذلك فوافقوه علي ما ألزم به."[1]

"علامہ محمد صاحب جوناگڑھی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1941ء) نے مندرجہ بالا عبارت کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا وہ ایک مصلحت وقت کی اقتضاء کا کام تھا، نہ کہ شرعی مسئلہ، ایک کام جو منع تھا، جو خلاف سنت تھا، لیکن اگر کسی سے ہو جائے تو شریعت اسے پکڑتی نہ تھی۔ جب لوگوں نے بکثرت بے خوف ہو کر اسے کرنا شروع کر دیا تو آپ نے بحیثیت قانون یہ حکم فرمایا کہ میں آئندہ سے تین کو تین ہی گن لوں گا۔ یہ صرف اس لیے تھا کہ لوگ ایک ساتھ تین طلاقیں دینے سے باز رہ جائیں، ورنہ پھر تین سال تک یہ حکم شرعی

[1] إعلام الموقعين: 4/ 390-389

کیوں جاری نہ کیا، پس یہ حکم شرعی نہیں بلکہ قانونی حیثیت رکھتا ہے کہ لوگ ڈر جائیں کہ اگر اب ہم نے ایسا کیا تو بیوی نکاح سے باہر ہو جائے گی جب تک وہ دوسرے سے نکاح نہ کرے۔ اور نکاح بھی با قاعدہ رغبت کے ساتھ دوام کے لیے ہو، نہ یہ کہ حلال کر کے چھوڑ دے کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حلالہ کے سخت ترین مخالف تھے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خیال یہ ہوا کہ پہلے لوگوں کے لائق جو تھا اس سے اس وقت کے لوگ محروم کر دیئے جانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ وہ اس طرح پے در پے طلاقیں نہیں دیتے تھے۔ طلاق کے معاملے میں طریقہ طلاق کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اللہ سے ڈرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ آسانی کر رکھی تھی۔ اب جبکہ یہی چیز برابر ہونے لگی تو کیا انہیں اس انعام الٰہی سے محروم نہ کر دیں تاکہ ان کے دماغ اور ان کے فعل پھر درست ہو جائیں۔ پس یہ فتویٰ گویا ایک درہ فاروقی تھا جو کہ ان کی سزا کے لیے تھا نہ یہ کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حکم شرعی بدل دیا۔"

مشروع طلاق ایک کے بعد ایک ہے، نہ کہ سب ایک ساتھ، جو ایسا کرتا ہے وہ حد سے گزر جاتا ہے، اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور احکام الٰہی کے ساتھ کھیل کرتا ہے، پس وہ اس قابل ہو گیا کہ حاکم وقت بطور سزا دہی کے اس پر کوئی سختی کر دے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے کھیلتا ہے تو کیوں نہ رخصت الٰہی سے محروم کر دیا جائے تاکہ اس کی آنکھیں کھل جائیں، پس یہ تو اسی قبیل سے ہے کہ زمانے کے بدلنے سے حکم بھی بدل جاتا ہے۔ اس حکمت کو مد نظر رکھ کر صحابہ نے بھی سیاست فاروقی کا ساتھ دیا اور ایسے فتوے دینے شروع کر دیئے۔[1]

اس کے علاوہ بھی کئی ارباب فقہ نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام تہدید و سیاست پر مبنی تھا۔ امام طحطاوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1231ھ) "در مختار" کے حاشیے میں علامہ قہستانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 313ھ) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"إن كان في الصدر الأول إذا أرسل الثلاث جملة لم يحكم إلا بوقوع واحدة إلى زمن عمر، ثم حكم بوقوع الثلاث سياسة لكثرته من الناس."[2]

"صدر اول میں جب تین طلاقیں اکٹھی دی جاتی تھیں تو ایک ہی کے واقع ہونے کا حکم لگایا جاتا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد تک یہی طریق کار تھا، پھر جب لوگوں نے کثرت سے ایسا کرنا شروع کر دیا۔ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے از روئے سیاست تینوں کے واقع ہونے کا فیصلہ نافذ کر دیا۔"

علامہ محمد بن علی المعروف باعلاء الحصکفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1677ھ) نے بھی علامہ قہستانی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی الفاظ

---

1 محمد جونا گڑھی، مولانا، دین محمدی ترجمہ اعلام الموقعین: 2/ 71، مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار، لاہور، 1999ء

2 الطحطاوي، أحمد بن محمد بن إسماعيل، حاشية الطحطاوي على الدر المختار :2/ 105، دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت

نقل کیے ہیں۔ "ڈاکٹر صبحی محمصانی رحمۃ اللہ علیہ نے عظیم محدث علامہ احمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1371ھ) کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ فعل ایک ہنگامی حکم کی حیثیت رکھتا ہے جو امام وقت (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ) نے بضرورت سیاست کیا تھا۔ علامہ احمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"جو احکام قرآن یا سنت کی نص صریح سے ثابت ہیں۔ انہیں نہ کسی کو تبدیل کرنے کا حق ہے اور نہ کوئی ان احکام کے علاوہ کسی دوسرے حکم کو اختیار کرنے کا مجاز ہے خواہ ایک شخص ہو یا پوری جماعت۔"[2]

حاصل کلام یہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کسی شرعی حکم میں تبدیلی نہیں کی بلکہ ایک غیر شرعی کام (بیک وقت تین طلاقیں دینے) سے روکنے کے لیے بطور سزا لوگوں کو رجوع کرنے سے روک دیا۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد ازاں انہیں یہ احساس ہوا کہ انہیں بطور سزا بھی یہ اقدام نہیں کرنا چاہیے تھا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ندامت

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"ماندمت علي شي ندامتي علي ثلاث أن لا أكون حرمت الطلاق."[3]

"مجھے تین باتوں پر شدید ندامت ہوئی (جن سے پہلے پہلا یہی طلاق والا مسئلہ ہے) کاش کہ میں طلاق (رجعی) کو حرام نہ کرتا۔"

واضح رہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ اقدام کی یہ توجیہ اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے کی گئی ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں اصلاً شرعاً رجعی ہیں، جیسا کہ اہل علم کی ایک معتدبہ تعداد اس کی قائل ہے۔ البتہ جمہور علماء کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اکٹھی تین طلاقیں بھی تین شمار ہوں گی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سرے سے کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ پہلے ہی سے یہ حکم تھا۔ ان کے نزدیک سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث جو مسلم میں مروی ہے، درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ اس اختلاف سے قطع نظر دونوں فریق اس امر پر متفق ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کسی شرعی حکم کو نہیں بدلا اور نہ انہیں ایسا کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ واللہ اعلم۔

چوتھا مسئلہ: کتابیہ سے نکاح پر پابندی

مولانا محمد تقی امینی رحمۃ اللہ علیہ نے احکام میں حالات کی رعایت سے توسیعی پروگرام کے تحت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی

---

[1] فی شرح الملتقی: 2/ 6

[2] شاكر، محمد أحمد، نظام الطلاق فی الإسلام : ص 19، مكتبة السنة، سنة النشر 1998م

[3] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر، إغاثة اللهفان من مصايد الشيطان: 1/ 336، مجمع الفقه الإسلامي، جدة، سنة النشر 1432هـ

اختیار کردہ بعض صورتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اس اقدام کا ذکر کیا ہے:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کتابیہ عورت سے نکاح کرنے کی ممانعت کر دی حالانکہ قرآن حکیم میں اس کی اجازت موجود ہے۔"[1]

مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زن کتابیہ سے ازروئے قرآن نکاح جائز ہے۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے اہل اسلام کو روک دیا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دور میں یہی کیا۔"[2]

غلام احمد صاحب پرویز نے عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم و عہد صدیقی رضی اللہ عنہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اختلافی فیصلوں کے ذیل میں لکھا ہے:

"قرآن کریم نے مسلمانوں کے لیے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا اور ان کا کھانا کھانا حلال قرار دیا ہے لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی عورتوں سے یہ کہہ کر نکاح ممنوع قرار دے دیا ہے کہ یہ عورتیں مسلمانوں کے معاشرہ میں فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں۔"[3]

حاصل یہ ہے کہ ایک قرآنی حکم کو حالات و ظروف کی تبدیلی سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بدل دیا۔

تجزیہ استدلال

اس سلسلہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے اگر اس پر تدبر کی نگاہ ڈالی جائے تو معاملے کی اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مولانا تقی امینی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وہ واقعہ امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 370ھ) کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ امام الجصاص رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"تزوج حذيفة يهودية فكتب إليه عمر أن خل سبيلها فكتب إليه حذيفة: أحرام هي؟ فكتب إليه عمر: لا ولكني أخاف أن تواقعوا المومسات منهن."[4]

"سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی خاتون سے شادی کر لی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لکھ بھیجا کہ اس سے علیحدگی اختیار کر لو۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جوابی خط لکھ کر پوچھا کہ کیا یہ حرام ہے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں یہ مکتوب ارسال کیا کہ میں حرام تو نہیں کہتا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم بدکار عورتوں کے جال میں پھنس جاؤ گے۔"

---

1 احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت: ص 176

2 اجتہادی مسائل: ص 20

3 شاہکار رسالت: ص 280

4 أحكام القرآن :3/ 323

کتابیہ سے شادی نہ کرنے کی حکمتیں

اس باب میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایسے حکیم و دانا شخص کے پیش نظر کئی حکمتیں تھیں، جن میں سے ایک حکمت کا تذکرہ مذکورہ واقعہ میں ہے۔

1۔ بدکار عورتوں کا خطرہ

اور وہ حکمت یہ ہے کہ کتابیہ کے بارے میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ عفت و عصمت سے تہی دامن نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ بدکار عورت سے نکاح کرنے میں بہت بڑا فتنہ ہے۔ بیوی انسان کی عزت و غیرت اور حمیت ہوتی ہے اگر وہ پاک دامن نہ ہو تو انسان کے لیے باعث ذلت و رسوائی ہے اور نسب میں بگاڑ کا سبب ہے، جسے کسی طور گوارا نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسلامی معاشرے میں اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

اور یہ کوئی خود ساختہ یا اجتہادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کی جس آیت میں کتابیہ عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے وہاں ساتھ ہی شرط بھی ہے کہ وہ پاک دامن اور عفت و عصمت سے متصف ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾[1]

"اور تم سے پہلے اہل کتاب کی پاکدامن عورتوں (سے نکاح جائز ہے)"

امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"فهذا يدل علي أن معني الإحصان عنده ههنا كان علي العفة."[2]

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس آیت میں مذکور اِحصان سے عفت و پاکدامنی مراد ہے۔"

2۔ مسلمانوں عورتوں کا نظر انداز ہو جانا

کتابیہ عورتوں سے نکاح نہ کرنے کی تلقین کرنے سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر یہ حکمت تھی کہ اس طرح مسلمان عورتوں کے نظر انداز ہونے کا ڈر ہے۔

امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 189ھ) نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول اس طرح بیان کیا ہے:

فإني أخاف أن يقتدي بك المسلمون فيختارون نساء أهل الذمة لجمالهن وكفي بذلك فتنة لنساء

---

[1] سورة المائدة: 5: 5

[2] أحكام القرآن: 3/ 323

المسلمین.[1]

"میں ڈرتا ہوں کہ دوسرے مسلمان تمہاری اقتدا کریں گے اور ذمیہ عورتوں کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ان کو ترجیح دیں گے۔ یہ بات مسلمان عورتوں کو فتنے میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک بڑی ٹھوس وجہ ہے کتابیہ عورتوں سے شادی کو روکنے کی۔ اگر ایسا ہو کہ مسلمان خواتین گھروں میں بیٹھی رہیں اور ان کی بجائے یہودی یا عیسائی عورتوں سے نکاح کا رجحان شروع ہو جائے تو ان مسلمان عورتوں کی کیا حالت ہو گی اور اس کے کیا کچھ مفاسد رونما ہوں گے، ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ لہٰذا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس حکمت کے پیش نظر سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو ایسا کرنے سے روک دیا۔

3۔ ملی مفادات متاثر ہونے کا خدشہ

یہ امر بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ خدشہ موجود ہو کہ اگر کتابیہ عورتوں سے نکاح کیا گیا تو وہ ملت دشمن غیر مسلم عناصر کی آلہ کار بن کر جاسوسی کے ذریعے ملت اسلامیہ کے مفادات کو زک پہنچا سکتی ہیں۔ خصوصاً جب معاملہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ کا ہو، جو مسلمانوں میں ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت کے حامل تھے۔

4۔ کتابیہ عورتوں کا مکر و فریب

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ کتابیہ عورتیں زیادہ تر مکار اور فریبی ہیں، لہٰذا ان سے نکاح کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ چنانچہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے استفسار پر انہوں نے فرمایا کہ "وہ مکارہ ہے۔"[2]

ممانعت، پابندی یا مشورہ، ایک اہم نکتہ

اس مقام پر فکر و ذہن کو ایک اہم نکتہ کی جانب ملتفت کرنا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ آیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو کتابیہ عورت سے علیحدہ ہونے کا کہنا، ممانعت اور پابندی تھی یا یہ محض ایک مشورہ؟ معاملے کی نوعیت پر غور کرنے سے یہ توجیہ زیادہ معقول و محکم معلوم ہوتی ہے کہ یہ محض ایک مشورہ تھا بالکل اسی طرح کا مشورہ جیسے ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار شخص اپنے کسی عزیز کو ایک معاملے سے متعلق اپنے علم و تجربہ کی روشنی میں مشورہ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک جائز کام سے کسی نقصان یا ضرر کا اندیشہ ہو تو اس سے باز رہنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ شے فی نفسہ حرام یا ممنوع ہے۔

---

[1] احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت: ص 177

[2] ابن قدامة، أبو محمد موفق الدين، المغني لابن قدامة: 7/ 501، مكتبة القاهرة، تايخ النشر، 1968م

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں بعینہ یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے استفسار پر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ صریحاً اس امر کا اظہار کرتے ہیں وہ کسی حلال وجائز معاملے کو حرام نہیں ٹھہرا رہے بلکہ بعض متوقع نقصانات (جن کا واقع ہونا ظن غالب پر مبنی ہے) کا تذکرہ کرتے ہیں۔ پھر کسی روایت سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کوئی عمومی حکم پوری سلطنت میں جاری فرمایا ہو کہ آج کے بعد کتابیہ عورت سے نکاح پر پابندی ہے۔ اس کی حیثیت محض ایک مشورہ ہی کی تھی، جو آپ نے ان تمام لوگوں کو دیا جو کہ کتابیہ عورتوں سے نکاح کر چکے تھے۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بھی مناسب رہے گا کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو مناسب سمجھتے ہوئے کچھ عرصہ بعد اپنی کتابیہ بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ (متوفی 620ھ) لکھتے ہیں:

"أَنَّ عُمَرَ قَالَ لِلَّذِينَ تَزَوَّجُوا مِنْ نِسَاءِ أَهْلِ الْكِتَابِ: طَلِّقُوهُنَّ. فَطَلَّقُوهُنَّ إلَّا حُذَيْفَةَ، فَقَالَ لَهُ عُمَرُ: طَلِّقْهَا. قَالَ: تَشْهَدُ أَنَّهَا حَرَامٌ؟ قَالَ: هِيَ جَمْرَةٌ، طَلِّقْهَا. قَالَ: تَشْهَدُ أَنَّهَا حَرَامٌ؟ قَالَ: هِيَ جَمْرَةٌ. قَالَ: قَدْ عَلِمْت أَنَّهَا جَمْرَةٌ، وَلَكِنَّهَا لِي حَلَالٌ. فَلَمَّا كَانَ بَعْدُ طَلَّقَهَا، فَقِيلَ لَهُ: أَلَا طَلَّقْتهَا حِينَ أَمَرَك عُمَرُ؟ قَالَ: كَرِهْت أَنْ يَرَى النَّاسُ أَنِّي رَكِبْت أَمْرًا لَا يَنْبَغِي لِي."[1]

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کتابیہ عورتوں سے نکاح کرنے والوں کو حکم دیا کہ ان عورتوں کو طلاق دے دی جائے تو سوائے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے سب نے طلاق دے دی۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "کیا آپ اس کے حرام ہونے کی گواہی دیتے ہیں؟" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "وہ مکارہ ہے، اسے طلاق دے دیں۔" سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ (زور دے کر) فرمایا: "کیا آپ اس کے حرام ہونے کی گواہی دیتے ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پھر وہی جواب دیا کہ "وہ مکارہ ہے" سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ بولے: "یہ تو میں جانتا ہوں کہ وہ مکارہ ہے تاہم وہ میرے لیے حلال ہے۔" (بات ختم ہوگئی) لیکن کچھ عرصہ بعد سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے از خود اسے طلاق دے دی۔ لوگوں نے پوچھا: "آپ نے یہ طلاق اس وقت کیوں نہ دی، جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو حکم دیا تھا؟" سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "میں اسے برا سمجھتا ہوں کہ لوگ مجھے وہ کام کرتا دیکھیں جو میرے لائق نہ تھا۔"

اس واقعہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش اور رجحان یہی تھا کہ کتابیہ عورتوں کو نکاح میں نہ رکھا جائے۔ جبکہ انہوں نے اسے قانون کی حیثیت سے جاری نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی رائے پر اصرار کے باوجود انہوں نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو ان کا موقف بدلنے پر مجبور نہیں کیا۔ البتہ بعد میں سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کے مشورے کی معقولیت اور حکمت کے پیش نظر اپنی کتابیہ بیوی کو طلاق دے دی۔

اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی حاکم کو شرعی حکم میں تبدیلی کا اختیار حاصل نہیں ہے اور نہ ہی سیدنا

[1] المغنی: 7/ 130

عمر رضی اللہ عنہ نے کسی حکم شرعی کو تبدیل کیا تھا۔

پانچواں مسئلہ: "مؤلفة القلوب" کی مد کا خاتمہ

منصوص احکام میں تبدیلی کی ایک مثال یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مصارف زکوٰۃ میں سے ایک مصرف "مؤلفة القلوب" ختم کر دیا تھا۔ غلام احمد صاحب پرویز لکھتے ہیں:

"قرآن کریم نے صدقات میں "مؤلفة القلوب" کا حصہ رکھا تھا۔ یعنی جن لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر کسی قسم کا ناقابل برداشت نقصان پہنچے۔ ان کے نقصان کی تلافی کے لیے حکومت ان کی مالی امداد کرے۔ یہ حکم عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور دور صدیقی رضی اللہ عنہ میں بھی جاری رہا لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب مسلمانوں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں اس لیے اس امداد کی ضرورت نہیں رہی۔"[1]

ڈاکٹر صبحی محمصانی "مؤلفة القلوب" سے متعلق قرآنی آیت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"باوجود اس صریح نص قرآنی کے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے "مؤلفة القلوب" کا حصہ موقوف کر دیا۔"[2]

پھر اس کی حکمت بیان کر کے آخر میں لکھتے ہیں:

"پس اس زمانے میں آیت مذکورہ کا حکم اشاعت اسلام اور اسے مدد پہنچانے کی مصلحت پر مبنی تھا۔ جب اسلام طاقت ور ہو گیا تو یہ ضرورت ختم ہو گئی، چنانچہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا جو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔"[3]

مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواری رحمۃ اللہ علیہ نے "شرعی تبدیلیوں کی مثالیں" دیتے ہوئے لکھا ہے:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآنی نص کے مطابق "مؤلفة القلوب" کو صدقہ وزکوۃ دی جاتی تھی لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ختم کر دیا۔"[4]

تجزیہ استدلال

"مؤلفة القلوب" سے متعلق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل منصوص حکم میں تبدیلی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ اس

---

1 شاہکار رسالت: ص 279

2 فلسفہ شریعت اسلام: ص 218

3 ایضاً

4 اجتہادی مسائل: ص 11؛ ان حضرات کے علاوہ مولانا محمد تقی امینی رحمۃ اللہ علیہ نے احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت: ص 182 اور مولانا محمد حنیف صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ اجتہاد: ص 203 میں بھی اس سے استدلال کیا ہے۔

صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب مصارف زکوٰۃ کے قرآنی حکم کی حقیقت اور نوعیت پر غور کیا جائے۔

چنانچہ اس ضمن میں غور و فکر کے بعد معاملے کی جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں جن لوگوں کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے وہ دراصل کچھ اوصاف سے متعلق ہے۔ جب یہ اوصاف ان میں ہوں گے اس وقت زکوٰۃ دی جائے گی، ورنہ نہیں۔ مثلاً ایک شخص اگر فقیر ہے تو اسے زکوٰۃ اس کے فقر کی وجہ سے دی جائے گی۔ گویا فقر ایک علت ہے، جس پر حکم کی بنیاد ہے۔

تحقیق المناط کا مسئلہ

یہی معاملہ "مؤلفة القلوب" کا ہے۔ یعنی جن لوگوں کی تالیف قلبی مقصود ہے۔ بایں طور کہ مسلمانوں کو ان کی مدد و نصرت کی ضرورت ہو تو ان کو تالیف قلبی کے لیے زکوٰۃ دی جائے گی۔ اگر یہ علت یا وصف موجود نہ ہو تو حکم کا اطلاق نہ ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحقیق المناط کا مسئلہ ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا موقف

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ ان کے عہد میں وہ علت اور وصف موجود نہیں ہے، جس کی بناء پر "مؤلفة القلوب" کو زکوٰۃ کی مد سے رقم دی جاتی تھی۔ کیونکہ پہلے اسلام حالت ضعف میں تھا لہٰذا ان کی مدد و اعانت کی ضرورت تھی۔ اب چونکہ اسلام قوت و شوکت حاصل کر چکا ہے اس لیے اب کسی قسم کی معاونت کی ضرورت نہیں رہی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی رحمۃ اللہ علیہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے منکرین حدیث کے اس استدلال، کہ خلفائے راشدین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو بدل ڈالا تھا، لہٰذا اب بھی حکمران (مرکز ملت) ایسا کرنے کا حق رکھتا ہے، کی تردید میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کی توجیہ یوں کرتے ہیں:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا استدلال یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلامی حکومت کو تالیف قلب کے لیے مال دینے کی ضرورت تھی اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مد سے لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ اب ہماری حکومت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ ہمیں اس غرض کے لیے کسی کو روپیہ دینے کی حاجت نہیں ہے، لہٰذا ہم اس مد میں کوئی روپیہ صرف نہیں کریں گے۔ کیا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا کوئی فیصلہ بدل ڈالا کیا واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہی تھا کہ تالیف قلب کی حاجت ہو یا نہ ہو، بہر حال کچھ لوگوں کو ضرور "مؤلفة القلوب" قرار دیا جائے اور صدقات میں سے ہمیشہ ہمیشہ ان کا حصہ نکالا جاتا رہے، کیا خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بھی یہ لازم قرار دیا ہے کہ صدقات کا ایک حصہ تالیف قلب کی مد میں ہر حال میں ضروری ہی خرچ کیا جائے۔"

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس موقف کا ذکر مولانا محمد حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"لیکن جب اسلام پروان چڑھا اور اسلامی سلطنت کو نفاق و کفر کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ

نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب یہ حصہ ان لوگوں کو نہیں ملے گا۔ ان کے اپنے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

"هَذَا شَيْءٌ كَانَ رَسُولُ الله ﷺ يُعْطِيكُمُوهُ لِيَتَأَلَّفَكُمْ عَلَى الْإِسْلَامِ، وَالْآنَ قَدْ أَعَزَّ الله الْإِسْلَامَ وَأَغْنِيَ عَنْكُمْ، فَإِنْ ثُبْتُمْ عَلَى الْإِسْلَامِ وَإِلَّا فَبَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ السَّيْفُ."[1]

"یہ وہ چیز تھی جو آنحضرت ﷺ تمہیں اس لیے دیا کرتے تھے کہ تمہارے دلوں میں اسلام کے لیے الفت پیدا ہو اور وحشت و نفرت جاتی رہے۔ لیکن اب جب کہ اللہ نے اسلام کو قوت و عزت بخشی ہے اور تمہاری تالیف قلبی سے اس کو بے نیاز کر دیا ہے تو تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اسلام پر جمے رہو ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار کا حکم ہے۔"[2]

ڈاکٹر صبحی محمصانی نے بھی یہی توجیہ بیان کی ہے، البتہ جواب کے آخر میں بیہقی سے یہ الفاظ زائد نقل کیے ہیں:

"ہم اسلام کے معاوضے میں تمہیں کچھ نہ دیں گے، لہٰذا جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر ہو جائے۔"[3]

مولانا محمد تقی امینی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ جصاص رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "احکام القرآن" کے حوالے سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"أن رسول الله ﷺ كان يتألفكما والإسلام يومئذ قليل و إن الله قد أغني الإسلام اذهبا فاجهدا جهدكما."[4]

"رسول اللہ ﷺ تم دونوں کی اس وقت تالیف کیا کرتے تھے جب کہ اسلام کمزور تھا اور مسلمان تعداد میں کم تھے اب اللہ نے اسلام کو غنی کر دیا ہے تم لوگ جاؤ اور اپنی مالی جدوجہد کرو۔"

توجیہہ درست، استدلال غلط

ان حضرات نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے استدلال کی توجیہات تو درست بیان کی ہیں، لیکن اس سے ان کا یہ استدلال صحیح نہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نصوص میں تبدیلی کی یا حکم کو منسوخ کر دیا۔ اس لیے کہ یہ نسخ یا تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ علت کی عدم موجودگی میں حکم کے انتفاء کا مسئلہ ہے۔ صاحب "مسلم الثبوت" نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے متعلق کہا ہے:

"ان من قبيل انتهاء الحكم لانتهاء العلة."[5]

---

1 ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد، فتح القدير :2/ 260، دار الفكر

2 مسئلہ اجتہاد: ص204

3 فلسفہ شریعت اسلام: ص218

4 أحكام القرآن :3/ 161

5 مسلم الثبوت : 2/ 84

"یہ علت کے انتفاء سے حکم کے انتفاء کی قبیل سے ہے۔"
اور "مؤلفۃ القلوب" کے الفاظ بھی اسی کی جانب اشارہ کناں ہیں۔

تمام مصارف میں زکوۃ صرف کرنا ضروری نہیں

اوپر مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے اقتباس میں یہ بات آئی ہے کہ ہر صورت میں "مؤلفۃ القلوب" کو حصہ دینا ضروری نہیں ہے۔ اس کی تائید امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 204ھ) کے اس قول سے ہوتی ہے:

"العامل والمؤلفة قلوبهم مفقودان في هذا الزمان، بقيت الأصناف الستة فالأولىٰ صرفها إلى الستة وأما إنه يعتبر في كل صنف منها مؤول لفظة إن كان موجودا." [1]

"عاملین زکوۃ اور مولفۃ القلوب اس زمانہ میں مفقود ہیں، صرف چھ قسم کے مستحقین باقی ہیں، اس لیے بہتر یہ ہے کہ انہی چھ قسموں میں زکوۃ کا روپیہ صرف کیا جائے اور یہی حال ان میں سے ہر مصرف کا ہے یعنی مصرف کی ضرورت نہ ہوگی اس میں صرف نہ کیا جائے گا گویا ہر مصرف کے ساتھ یہ لفظ لگا ہوا ہے کہ اگر وہ موجود ہو۔"

"مؤلفۃ القلوب" کا مصرف تا قیامت باقی ہے

بہر آئینہ "مؤلفۃ القلوب" کا مصرف قیامت تک کے لیے باقی ہے، لہٰذا جب بھی ضرورت و مصلحت کا تقاضا ہوگا اس مد میں سے زکوۃ ادا کی جائے گی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چونکہ ضرورت محسوس نہ کی اور شرعی حکم کی علت موجود نہ سمجھی تو اس پر عمل نہیں فرمایا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔

مولانا سید ابو الاعلی صاحب مودودی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ سے متعلق مختلف آراء نقل کرنے کے بعد راجح نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ "مؤلفۃ القلوب" کا حصہ قیامت تک کے لیے ساقط ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلاشبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ اگر اسلامی حکومت تالیف قلب کے لیے مال صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھتی ہو تو کسی نے اس پر فرض نہیں کیا ہے کہ ضرور ہی اس مد میں کچھ نہ کچھ صرف کرے، لیکن اگر کسی وقت اس کی ضرورت محسوس ہو تو اللہ نے اس کے لیے جو گنجائش رکھی ہے اسے باقی رہنا چاہیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع جس امر پر ہوا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ان کے زمانے میں جو حالات تھے اس میں تالیف قلب کے لیے کسی کو کچھ دینے کی وہ حضرات ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اس

[1] الأندلسي، أبو حيان محمد بن يوسف، البحر المحيط: 5/ 442، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى، 1420هـ

سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع نے اس مد کو قیامت تک کے لیے ساقط کر دیا جو قرآن میں بعض اہم مصالح دینی کے لیے رکھی گئی تھی۔"[1]

حاصل یہ ہے کہ بوقت ضرورت "مؤلفة القلوب" کی مد سے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں کوئی تبدیلی کی نہ اسے منسوخ کیا، لہٰذا انکے اس اقدام سے تبدیلی احکام پر استدلال درست نہیں ہے۔

"مؤلفة القلوب" کو مال دینے کی پرویزی توجیہ

آخر میں پرویز صاحب کی اس توجیہ پر مختصر تبصرہ بھی مناسب رہے گا کہ "مؤلفة القلوب" کے حصہ سے مراد یہ ہے:

"جن لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر کسی قسم کا ناقابل برداشت نقصان پہنچے، ان کی تلافی کے لیے حکومت ان کی مالی امداد کرے۔"[2]

یہ درست ہے کہ اگر کسی کو ایسے حالات کا سامنا ہو تو اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ "مؤلفة القلوب" کی مد سے زکوٰۃ صرف اسی نوعیت کے حالات سے دوچار لوگوں کے لیے ہے۔ علماء نے صراحت کی ہے کہ اگر مال دار بھی ہے تو بھی اسے اس مد سے رقم دی جاسکتی ہے۔

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ "مؤلفة القلوب" کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایسے لوگوں کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں، تب ہی ان کی مدد کی جاسکتی ہے، بلکہ وہ مال دار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیئے جانے کے مستحق ہیں۔"[3]

حاصل یہ کہ حاصل برداشت نقصان نہ بھی ہو تو اس مد سے رقم دی جاسکتی ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ اس طرح کے نقصان کی زد میں آئے ہوں۔ بلکہ اس طرح کے لوگ فقیر و مسکین یا 'الغارمین' کی مدات میں بھی آسکتے ہیں تالیف قلب کا تعلق اصل میں مال سے نہیں بلکہ دلی احساسات و جذبات کو مائل کرنے سے جیسا کہ خود یہ لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔

چھٹا مسئلہ: 'ام ولد' کی فروخت پر پابندی

حالات و زمانہ کی تبدیلی سے شرعی احکام میں تغیر و تبدل کے حق میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے امہات اولاد کی بیع ممنوع قرار دے دی تھی، حالانکہ پہلے منع نہ تھی۔

---

1 مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، تفہیم القرآن: 2/ 207 ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، طبع ہفتم، 1973ء

2 شاہکار رسالت: ص 279

3 تفہیم القرآن: 2/ 206

غلام احمد صاحب پرویز اس کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ام ولد (یعنی وہ لونڈی جس کے مالک سے اس کی اولاد ہو گئی ہو) کی بیع ممنوع قرار دے دی، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کی ممانعت نہیں تھی۔"[1]

تجزیہ استدلال

اس استدلال کی بنیاد اس نکتے پر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں 'ام ولد' کی خرید و فروخت جائز اور درست تھی، لیکن بعد میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر بندش عائد کر دی۔ لیکن امر واقعہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ الٹا تردید ہوتی ہے۔

'ام ولد' کی فروخت پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پابندی لگائی

حقیقت یہ ہے کہ 'ام ولد' کی فروخت کی ممانعت خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت سے ثابت ہے۔ اس کے دلائل درج ذیل ہے:

1. سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد والی لونڈیوں کو بیچنے سے منع فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«لا يبعن ولا يوهبن ولا يورثن يستمتع بها السيد مادام حيا وإذا مات فهي حرة.»[2]

"نہ وہ بیچی جا سکتی ہیں، نہ ہبہ کی جا سکتی ہیں اور نہ ترکہ میں شمار ہو سکتی ہیں۔ جب تک ایسی لونڈی کا مالک زندہ ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جب وہ مر جائے تو وہ لونڈی آزاد ہے۔"

2. سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«من وطئ أمته فولدت له فهي معتقة عن دبر.»[3]

"جس شخص نے اپنی لونڈی سے مباشرت کی، پھر اس سے اس کا بچہ پیدا ہو گیا تو وہ لونڈی اس شخص کے مرنے کے بعد آزاد ہو گی۔"

3. سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ام ابراہیم (ماریہ قبطیہ) کا ذکر کیا گیا

---

[1] شاہکار رسالت: ص280

[2] الشوكاني، محمد بن علي، نيل الأوطار: 6/ 115، قال الشوكاني وفي إسناده الحسين بن عبد الله الهاشمي وهو ضعيف جدا وقد رجح جماعة وقفه علي عمر، دار الحديث مصر، الطبعة الأولى، 1993م

[3] ابن حنبل، أبو عبد الله أحمد بن محمد، مسند الإمام أحمد بن حنبل، مسند عبد الله بن عباس: 2937، قال شعيب الأرنؤوط، حسن، وهذا إسناده ضعيف، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى، 2001م

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أعتقها ولدها.»[1]

''اس کا بچہ اس کی آزادی کا سبب بن گیا۔''

ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ خود رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم ہی 'ام ولد' کو بیچنے سے منع کر دیا تھا۔ لہذا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں کوئی بتدیلی نہیں کی۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سنت کی پیروی میں ممانعت کی

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے امہات الأولاد کی خرید و فروخت کی ممانعت انہی ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بناء پر کی تھی۔ سیدنا سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 94ھ) کا بیان ہے:

''أن عمر أعتق أمهات الأولاد وقال أعتقهن رسول الله ﷺ.''[2]

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے امہات اولاد کو آزاد کیا اور کہا کہ انہیں رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد فرمایا ہے۔''

جمہور علماء کا مسلک

مسئلہ زیر بحث میں جمہور علمائے امت کا نقطہ نگاہ یہی ہے کہ امہات الأولاد کی بیع ممنوع ہے۔ بلکہ بعض فقہاء نے تو اس پر اجماع کا دعوی بھی کیا ہے۔ علامہ محمد بن علی الشوکانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1255ھ) تحریر کرتے ہیں:

''وقد استدل بحديثي ابن عباس المذكورين في الباب وحديث ابن عمر القائلون بأنه لا يجوز بيع أمهات الأولاد وهم الجمهور، وقد حكي ابن قدامة إجماع الصحابة علي ذلك.''[3]

''جمہور اہل علم امہات الاولاد کی بیع کو ناجائز کہتے ہیں اور ان کا استدلال اوپر مذکور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی احادیث سے ہے۔ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع کا دعوی کیا ہے۔''

یہ دعویٰ اجماع اگرچہ صحیح نہیں تاہم سلف صالحین کی عظیم اکثریت اسی موقف کی قائل ہے۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک طویل بحث کے بعد اسی کو مبنی پر احتیاط قرار دیا ہے۔[4]

---

[1] سنن ابن ماجة، كتاب العتق، باب أمهات الأولاد: 2516، قال الألباني هذا الحديث ضعيف

[2] البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي، السنن الكبرى، كتاب عتق أمهات الأولاد، باب الرجل يطأ أمته بالملك فتلد له: 21772، قال محمد عبد القادر عطاء، تفرد الإفريقي ويرفعه إلى النبي ﷺ وهو ضعيف، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة، 2003م

[3] نيل الأوطار: 6/ 117

[4] نيل الأوطار: 11/ 452

بیع 'ام ولد' کی دلیل جواز کا جائزہ

اس امر کے حق میں کہ عہد رسالت مآب ﷺ اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں 'ام ولد' کی بیع جائز تھی ابوداؤد کی ایک روایت پیش کی جاتی ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شرعی حکم میں تبدیلی کی تھی۔ وہ روایت یہ ہے:

"عن جابر رضی الله تعالی عنه قال: بعنا أمهات الأولاد علي عهد رسول الله ﷺ وأبي بكر فلما كان عمر نهانا فانتهينا." [1]

"سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے زمانے اور عہد صدیقی میں امہات الاولاد کی بیع کیا کرتے تھے۔ مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیں اس سے منع کیا تو ہم اس سے رک گئے۔"

اگر امہات الاولاد کی بیع کے سلسلہ میں رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کو سامنے رکھا جائے تو اس کی کئی توجیہات کی جاسکتی ہیں:

1. ایک محمل اس روایت کا یہ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں 'ام ولد' کی خرید وفروخت کی ہو لیکن آپ کو علم نہ ہوا ہو، لہٰذا یہ تقریری سنت نہیں بن سکتی۔ پس اس سے استدلال بھی درست نہیں۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 388ھ) "معالم السنن" میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے تحت لکھتے ہیں:

"ويحتمل أن يكون هذا الفعل منهم في زمان النبي ﷺ وهو لا يشعر بذلك لأنه أمر يقع نادرا وليست أمهات الأولاد كسائر الرقيق." [2]

"اس امر کا احتمال ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا کیا ہو اور آپ کو اس کا علم نہ ہوا ہو، اس لیے کہ 'ام ولد' کی خرید وفروخت کا معاملہ شاذ ونادر ہی پیش آتا تھا اور اس لیے بھی کہ امہات الاولاد عام غلاموں کی طرح نہیں تھیں۔"

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 458ھ) بھی اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم تھا۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

"وليس في شيء من الطرق أن النبي ﷺ اطلع علي ذلك يعني بيع أمهات الأولاد وأقرهم عليه." [3]

---

[1] سنن أبي داؤد، كتاب العتق، باب في عتق أمهات الأولاد:3954، قال الألباني هذا الحديث صحيح

[2] الخطابي، أبوسليمان حمد بن محمد، معالم السنن:4/ 74، المطبعة العلمية، حلب، الطبعة الأولى، 1932م

[3] العظيم آبادي، محمد أشرف بن أمير بن علي، عون المعبود شرح سنن أبي داؤد، ومع حاشية ابن القيم: 10/ 347، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية، 1415هـ

"کسی طریق سے یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ رسول اکرم ﷺ کو امہات الاولاد کی بیع کا علم ہوا ہو اور آپ ﷺ نے اسے برقرار رکھا ہو۔"

2. دوسری توجیہ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے پہل تو 'ام ولد' کی بیع جائز ہو لیکن بعد میں اس سے روک دیا گیا ہو یعنی یہ جواز منسوخ ہو گیا ہو۔ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ اس توجیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"وقد يحتمل أن يكون ذلك مباحا في العصر الأول ثم نهي النبي ﷺ عن ذلك قبل خروجه من الدنيا ولم يعلم به أبو بكر رضى الله تعالى عنه، لأن ذلك لم يحدث في أيامه لقصر مدتها واشتغاله بأمور الدين ومحاربة أهل الردة واستصلاح أهل الدعوة ثم بقي الأمر علي ذلك في عصر عمر رضى الله تعالى عنه مدة من الزمان ثم نهي عمر رضى الله تعالى عنه حين بلغه ذلك عن رسول الله ﷺ فانتهوا. "[1]

"یہ احتمال بھی ہے کہ عصر اول میں 'ام ولد' کی بیع مباح ہو پھر اس دنیا سے رحلت کے وقت رسول اکرم ﷺ نے اس سے روک دیا ہو لیکن سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات نہ آسکی ہو کیونکہ ان کی مدت خلافت انتہائی کم تھی اور ان دنوں اس بیع کا زیادہ رواج نہ تھا۔ مزید برآں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دینی معاملات، ارتداد کے خلاف جنگوں اور اہل دعوت کی بہتری کے لیے اقدامات میں مصروف رہے لہذا آپ کو علم نہ ہونا مستبعد نہیں۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک ایک عرصہ تک معاملہ اسی طرح چلتا رہا۔ بعد ازاں جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم ﷺ کی ممانعت کا علم ہوا تو آپ نے لوگوں کو اس سے روک دیا چنانچہ وہ باز آگئے۔"

اس سے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے موقف کی بنیاد کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاید وہ نسخ سے لاعلمی کی بناء پر اس کے جواز کے قائل رہے ہوں۔

علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1329ھ) اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"وقال التور بشتي يحتمل أن النسخ لم يبلغ العموم في عهد الرسالة ويحتمل أن بيعهم في زمان النبي ﷺ كان قبل النسخ وهذا ا أولي التاويلين وأما بيعهم في خلافة أبي بكر رضى الله تعالى عنه فلعل ذلك كان في فرد قضية فلم يعلم به أبوبكر رضي الله عنه ولامن كان عنده علم بذلك، فحسب جابر رضى الله تعالى عنه أن الناس كانوا علي تجويزه فحدث ما تقرر عنده في أول الأمر، فلما اشتهر نسخه في زمان عمر رضى الله تعالى عنه عاد إلي قول الجماعة، يدل عليه قوله فلما كان عمر رضى الله تعالى عنه نهاناعنه فانتهينا انتهى. "[2]

"امام تور بشتی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1263ھ) کا کہنا ہے کہ اس میں یہ امکان بھی موجود ہے کہ عام لوگوں کو عہد

[1] معالم السنن: 4/ 74

[2] عون المعبود ومعه حاشية ابن القيم: 10/ 349

رسالت ﷺ میں ہونے والے نسخ کی خبر نہ ہو سکی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں جو 'ام ولد' کی بیع کرتے تھے وہ نسخ سے پہلے ہو دونوں میں سے یہ تاویل زیادہ مناسب ہے۔ جہاں تک عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں امہات الاولاد کی خرید و فروخت کا مسئلہ ہے تو اس میں احتمال یہ ہے کہ ایسا ایک آدھ قضیہ ہی ہوا ہو لیکن سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یا دیگر ان حضرت کو معلوم نہ ہو سکا جو نسخ کا علم رکھتے تھے۔ اس سے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا کہ لوگ اسے جائز ہی خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے وہی بیان کیا جو پہلے سے ان کے نزدیک ثابت شدہ تھا۔ پھر جب عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں نسخ کی شہرت ہوئی تو انہوں نے جماعت کے نقطہ نظر کی طرف رجوع کر لیا ہو۔ ان کا یہ قول بھی اس کی طرف اشارہ کناں ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیں روکا تو ہم رک گئے۔"

مندرجہ بالا تفصیلات کا حاصل یہ ہے:

1. امہات الاولاد کی بیع کو خود نبی اکرم ﷺ نے ممنوع قرار دیا تھا۔
2. سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسی بناء پر اس سے روکا تھا، یہ کوئی تبدیلی نہ تھی۔
3. جو لوگ اس وقت تک 'ام ولد' کی بیع کو جائز سمجھتے تھے انہیں نبی اکرم ﷺ کی ممانعت کا علم نہ تھا۔
4. امت کے ارباب فقہ و اجتہاد کی عظیم اکثریت امہات الاولاد کی بیع کرنا جائز قرار دیتی ہے۔

لہٰذا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ انہوں نے کسی منصوص حکم میں حالات و زمانہ کی رعایت سے تبدیلی کی ہے۔

ساتواں مسئلہ: شرابی کی سزا میں ردوبدل

شرعی احکام میں تغیر و تبدل کے قائلین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو بھی اپنے نقطہ نگاہ کے حق میں پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے شرابی کی سزا اسی کوڑے متعین کی تھی جبکہ اس سے پہلے ایسا نہ تھا۔ غلام احمد پرویز رقمطراز ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شراب خور کو جوتے وغیرہ مار کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شرابی کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بڑھا کر اسی کوڑے کر دیا۔"[1]

مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواری رحمۃ اللہ علیہ "شرعی تبدیلیوں کی مثالیں" بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک شرابی کی تعزیر چالیس درے تھی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے 80 کر دیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے دونوں ہی پر مختلف اوقات میں عمل کیا۔"[2]

---

[1] شاہکار رسالت: ص 279

[2] اجتہادی مسائل: ص 9

تجزیہ استدلال

اس ضمن میں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ کیا شراب خوری کی سزا متعین ہے یا اسے حاکم اور ذمہ دار اتھارٹی کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیا شرابی کی عقوبت حدود کے زمرے میں آتی ہے یا اسے دائرہ تعزیرات میں شامل کیا جائے گا؟

شراب نوشی کی سزا تعزیر ہے، حد نہیں؟

شرعی دلائل میں غور و فکر کرنے سے اس سوال کا جو جواب صحیح معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شراب نوشی کی سزا متعین نہیں یعنی اسے حدود میں شمار نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ ایک تعزیری سزا ہے جس کے دلائل درج ذیل ہیں:

پہلی دلیل

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 275ھ) روایت کرتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَمْ يَقِتْ فِي الْخَمْرِ حَدًّا»، وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: شَرِبَ رَجُلٌ فَسَكِرَ، فَلُقِيَ يَمِيلُ فِي الْفَجِّ، فَانْطُلِقَ بِهِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَلَمَّا حَاذَى بِدَارِ الْعَبَّاسِ، انْفَلَتَ فَدَخَلَ عَلَى الْعَبَّاسِ فَالْتَزَمَهُ، فَذُكِرَ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَضَحِكَ، وَقَالَ: «أَفَعَلَهَا؟» وَلَمْ يَأْمُرْ فِيهِ بِشَيْءٍ [1]

"سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے شراب نوشی پر کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے شراب پی لی اس سے اسے نشہ ہو گیا اور وہ گلی میں لہرا لہرا کر چلنے لگا۔ اسے نبی کریم ﷺ کے پاس لے جایا جانے لگا۔ جب وہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس آیا تو وہ گھبرا کر ان کے گھر میں داخل ہو گیا اور ان سے جا چمٹا۔ جب نبی کریم ﷺ کو یہ بتایا گیا تو آپ ﷺ ہنس پڑے اور پوچھا: کیا واقعی اس نے اس طرح کیا؟ اور پھر آپ ﷺ نے اس کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔"

دوسری دلیل

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"مَا كُنْتُ لِأُقِيمَ حَدًّا عَلَى أَحَدٍ فَيَمُوتَ، فَأَجِدَ فِي نَفْسِي، إِلَّا صَاحِبَ الخَمْرِ، فَإِنَّهُ لَوْ مَاتَ وَدَيْتُهُ، وَذَلِكَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَمْ يَسُنَّهُ." [2]

"اگر میرے حد لگانے کے نتیجے میں کوئی مر جائے تو مجھے اس پر کوئی رنج و غم نہیں ہو گا۔ سوائے شرابی کے کہ اگر حد لگانے کے نتیجہ میں وہ مر جائے تو میں اس کی دیت ادا کروں گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے شراب نوشی پر سزا دینے کا کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا تھا۔"

[1] سنن أبي داؤد، كتاب الحدود، باب الحد في الخمر: 4476، قال الألباني هذا الحديث ضعيف

[2] صحيح البخاري، كتاب الحدود، باب الضرب بالجريد والنعال: 6778

سنن ابن ماجہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ منقول ہیں:

"ما كنت أدي من أقمت عليه الحد إلا شارب الخمر فإن رسول الله ﷺ لم يسن فيه شيئا إنما هو شيء جعلناه نحن."[1]

"جس شخص پر میں حد قائم کروں (اور وہ اس کے نتیجے میں مر جائے) تو میں اسکی دیت نہیں دونگا سوائے شرابی کے (کہ وہ اگر دوران حد مر جائے تو اس کی دیت میرے ذمے ہوگی) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلے میں کوئی سزا مقرر نہیں کی ہے کہ سزا ہم نے اپنی طرف سے مقرر کی ہے۔"

تیسری دلیل

سیدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

قَالَ: كُنَّا نُؤْتَى بِالشَّارِبِ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَإِمْرَةِ أَبِي بَكْرٍ وَصَدْرًا مِنْ خِلاَفَةِ عُمَرَ، فَنَقُومُ إِلَيْهِ بِأَيْدِينَا وَنِعَالِنَا وَأَرْدِيَتِنَا، حَتَّى كَانَ آخِرُ إِمْرَةِ عُمَرَ، فَجَلَدَ أَرْبَعِينَ، حَتَّى إِذَا عَتَوْا وَفَسَقُوا جَلَدَ ثَمَانِينَ[2]

"رسول اللہ ﷺ، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دور میں جب شرابی کو پکڑا کر لایا جاتا تو ہم اٹھ کر ہاتھوں، جوتوں اور کپڑے (کے کوڑوں) سے اس کی پٹائی کرتے تھے۔ یہ معاملہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور تک چلتا رہا، آخر دور خلافت میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شرابی کو چالیس کوڑے لگانے شروع کیے پھر جب لوگ (اس سلسلے میں) حد سے بڑھنے لگے تو انہوں نے چالیس کی بجائے اسی کوڑے لگائے۔"

چوتھی دلیل

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

أن النبي ﷺ ضرب في الخمر بالجريد والنعال وجلد أبوبكر أربعين[3]

"نبی اکرم ﷺ شرابی کو کھجور کی ٹہنی اور جوتوں سے مارا کرتے تھے اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کو چالیس کوڑے لگاتے تھے۔"

صحیح مسلم اور ابو داؤد میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت قدرے تفصیل سے بیان ہوئی ہے، اس میں مذکور ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَلَدَ فِي الْخَمْرِ بِالْجَرِيدِ، وَالنِّعَالِ»، ثُمَّ جَلَدَ أَبُو بَكْرٍ أَرْبَعِينَ، فَلَمَّا كَانَ عُمَرُ، وَدَنَا النَّاسُ

---

[1] سنن ابن ماجة، كتاب الحدود، باب حد السكران: 2569، قال الألباني هذا الحديث صحيح

[2] صحيح البخاري، كتاب الحدود، باب الضرب بالجريد والنعال: 6779

[3] صحيح البخاري، كتاب الحدود، باب ما جاء في ضرب شارب الخمر: 6773

مِنَ الرِّيفِ وَالْقُرَى، قَالَ: «مَا تَرَوْنَ فِي جَلْدِ الْخَمْرِ؟» فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ: أَرَى أَنْ تَجْعَلَهَا كَأَخَفِّ الْحُدُودِ، قَالَ: «فَجَلَدَ عُمَرُ ثَمَانِينَ.»[1]

"نبی کریم ﷺ شراب نوشی میں کھجور کی ٹہنی اور جوتوں سے مارا کرتے تھے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چالیس کوڑے مارنے شروع کیے۔ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگوں نے شہروں سے نکل کر گاؤں میں کھلی فضاؤں میں رہن سہن اختیار کیا اور آسودہ ہوگئے (تو شراب نوشی کی کثرت ہوگئی) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس صورتحال کو بھانپ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شراب نوشی کی سزا کے بارے رائے طلب کی۔ سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میری رائے میں سزا کے لحاظ سے کم تر حد والی سزا اس پر جاری کی جائے۔ ان کے مشورہ پر عمل کر کے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے کی سزا مقرر کی۔"

پانچویں دلیل

عَن أبي هريرة رَضي الله تعالى عَنه، أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ، قَالَ: «اضْرِبُوهُ» قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهِ، وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهِ، وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ، قَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: أَخْزَاكَ اللَّهُ، قَالَ: «لاَ تَقُولُوا هَكَذَا، لاَ تُعِينُوا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ.[2]

"سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شرابی لایا گیا۔ آپ نے حاضرین مجلس کو اسے مارنے کا حکم دیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سے کوئی اس کو ہاتھ سے مار رہا تھا، کوئی جوتے سے اور کوئی کپڑے (کے کوڑے) سے جب وہ جانے لگا تو کسی نے اسے بد دعا دیتے ہوئے کہا: اللہ تجھے رسوا کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس طرح نہ کہو! اس کے معاملے میں شیطان کی مدد نہ کرو۔"

چھٹی دلیل

سیدنا عقبہ بن الحارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ جِيءَ بِالنُّعَيْمَانِ أَوْ بِابْنِ النُّعَيْمَانِ ،شَارِبًا فَأَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ كَانَ بِالْبَيْتِ أَنْ يَضْرِبُوهُ قَالَ فَضَرَبُوهُ فَكُنْتُ أَنَا فِيمَنْ ضَرَبَهُ بِالنِّعَالِ[3]

"سیدنا عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نعیمان یا ابن نعیمان کو شراب کے نشہ میں لایا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے گھر میں موجود لوگوں کو حکم دیا کہ انہیں ماریں۔ انہوں نے مارا۔ سیدنا عقبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں بھی ان لوگوں میں تھا جنہوں نے اس کو جوتوں سے مارا۔"

---

[1] صحیح مسلم، كتاب الحدود، باب حد الخمر: 1706

[2] صحيح البخاري، كتاب الحدود، باب الضرب بالجريد والنعال: 6777

[3] صحيح البخاري، كتاب الحدود، باب من أمر بضرب الحد في البيت: 6774

ساتویں دلیل:

جلیل القدر تابعی اور حدیث کے عظیم عالم امام ابن شہاب الزہری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے:

"أن النبي ﷺ لم يفرض في الخمر حدا وإنما كان يأمر من حضره أن يضربوه بأيديهم ونعالهم."[1]

"رسول اللہ ﷺ نے شراب نوشی کے بارے میں کوئی حد مقرر نہیں کی، بلکہ آپ حاضرین کو اسے مارنے کا حکم دیتے تھے وہ ہاتھوں اور جوتوں سے اس کی پٹائی کرتے تھے۔"

مندرجہ بالا روایات کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب نوشی پر کوئی متعین سزا مقرر نہیں فرمائی اور نہ ہی قرآن شریف میں اس کا ذکر آیا ہے، لہٰذا یہ تعزیرات میں داخل ہے۔ اور تعزیر حاکم اور ذمہ دار اتھارٹی کی صوابدید پر ہوتی ہے کہ وہ جس قدر مصلحت کا تقاضا دیکھے، اس کے مطابق سزا دے دے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ شراب نوشی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے تو انہوں نے اس کی سزا 40 سے بڑھا کر 80 کوڑے کر دی۔ اس کی وضاحت "سنن ابی داؤد" کی درج ذیل روایت سے ہوتی ہے:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں خط لکھا کہ لوگ کثرت سے شراب پینے لگے ہیں اور اس کی سزا (جو عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں 40 کوڑے تھی) کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ آپ کے پاس کبار صحابہ رضی اللہ عنہم موجود ہیں تو ان سے اس کا حل دریافت کیجئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین اولین سے مشورہ کیا تو یہ متفقہ تجویز سامنے آئی کہ شرابی کو 80 کوڑے لگائے جائیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے 80 کوڑوں کی توجیہ یہ بیان کی کہ شراب پی کر نشہ ہو جاتا ہے اور نشے میں ہذیان بکتے ہوئے دوسروں پر بہتان طرازی ہوتی ہے، لہٰذا شرابی کو حد قذف کے بقدر (اسی) کوڑے لگانے چاہیں۔"[2]

المختصر جب شریعت نے شراب نوشی کی کوئی سزا متعین ہی نہیں کی تو اس میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تبدیلی کیسے کر دی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایک سزا مقرر کی ہے جو عین تقاضائے مصلحت تھی۔ مولانا محمد تقی امینی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شرابی کی سزا اسی (80) کوڑے مقرر کی جب کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں سزا کی تعیین نہ تھی۔"[3]

حیرت اس امر پر ہے کہ مولانا جعفر شاہ پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف اسے تعزیر قرار دیتے ہیں اور پھر اسے "شرعی تبدیلی" بھی کہتے ہیں؟ جب یہ تعزیری سزا ہے تو یہ شرعی تبدیلی کیسے بن گئی؟ بہر آئینہ اس اقدام فاروقی رضی اللہ عنہ سے یہ استدلال درست نہیں ہے کہ انہوں نے کسی شرعی حکم میں تبدیلی کی تھی۔

---

[1] نيل الأوطار: 7/ 169

[2] سنن أبي داؤد، كتاب الحدود، باب إذا تتابع في شرب الخمر: 4489، قال الألباني هذا الحديث حسن

[3] احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت: ص 181